جلد ۳۲ | ماہ شعبان المعظم سنہ ۱۳۵۲ھ مطابق ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۳ء | عدد ۶

مضامین

شذرات

اس ماہ کے سلسلۂ مقالات میں "سفرِ افغانستان" کے عنوان سے پہلا مقالہ درج ہے، جسمیں اس سفر کے سرسری اور جزئی حالات کا بیان ہے، کہیں کہیں غیر اہم باتیں بھی آگئی ہیں، جسکا سبب یہ ہے کہ غیر ملک کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی سیاح کو نئی اور انوکھی معلوم ہوتی ہیں، سفر کے سرسری واقعات کے ختم ہونے کے بعد اس ملک کے حالات پر ایک مفصل تبصرہ بھی حوالۂ قلم ہوگا، اسوقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس ملک کی اصلی خدمت یہ ہے کہ اسکو امن و امان اور سکون کے حصول کا موقع دیا جائے جو اسکو میسر نہیں آتا، پھر اسکو اسکی قبائلی زندگی سے نکال کر وسیع قومی و وطنی دائرہ میں آنے کی تلقین کیجائے، اور ملک میں صحیح تعلیم کی اشاعت عام کیجائے، اور وہاں کی مذہبی تعلیم میں نصاب و طریقۂ درس کی وہ اصلاح کیجائے، جس کی ضرورت آج تمام علمائے اسلام نے بالاتفاق تسلیم کرلی ہے،

افغانستان کے علمی و ادبی حلقہ میں روز افزوں ترقی کے آثار نمایاں ہیں، اس سلسلہ میں تاریخِ اسلام کی ضروری کتابوں کے ترجمے بھی ہورہے ہیں، اس سے پہلے علامہ شبلی مرحوم کی الفاروق کا فارسی ترجمہ وہاں شائع ہوچکا ہے، اور اب خاکسار کی سیرت عائشہؓ کا ترجمہ کیا گیا ہے، ترجمہ مکمل ہوچکا ہے، اور اسوقت سردار شاہ محمود خاں وزیر حربیہ کے مطالعہ میں ہے، موصوف صاحبِ سیف وقلم ہیں، میری نئی تصنیف خیام جو اس سفر میں میرے ساتھ تھی، جس ذوق و شوق سے انھوں نے لی، اس سے اُن کے ادبی و علمی شغف کا پتہ چلتا تھا، امید ہے کہ یہ ترجمہ چند ماہ کے بعد وہاں کے حالات کے سکون کے بعد شاہ ظاہر خاں کے عہد میں طبع ہوکر شائع ہو، عجب نہیں کہ وہ افغان خواتین کی نئی راہِ زندگی میں نمونہ اور اسوہ کا کام دے،

اس سلسلہ میں یہ خبر بھی مسرت افزا ہوگی کہ مکۂ معظمہ کے چند ادبا نے ملکر یہ تہیہ کیا ہے کہ دار المصنفین کی سیرۃ النبی اور سیرۃ عائشہؓ کا ترجمہ عربی زبان میں کریں، شیخ رشدی الصالح ملحس اڈیٹر ام القرٰی اس تجویز کے محرک ہیں، اگر یہ ترجمے واقعاً

چھپکر شائع ہوگئے تو امید ہے کہ دنیائے اسلام کے موروزن کے سامنے اسلام کے دونوں صنفوں کے بہترین نمونے آجائینگے،

صوبہ بہار کے بعض نوجوانوں نے صوبہ کے علمی و روحانی مرکز پھلواری میں جو اب سلسلۂ آبادی میں صوبہ کے دار الحکومت پٹنہ سے ملحق ہورہا ہے، ایک مسلم اکاڈیمی کا خواب دیکھا ہے، یہ مجلس گو شروع تو تاریخ کی ایک شخصی کوشش سے ہوئی، مگر اب چند سال سے یہ ایک جماعتی مجلس کے قالب میں ڈھل رہی ہے، مجلس کے مقاصد حسب ذیل ہیں، زبان اردو کی توسیع و ترویج، ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کو حقیقی اسلامی روایات اور سچے کارناموں سے روشناس کرنا، اسلام اور شاہانِ اسلام کے متعلق جو غلط فہمیاں ہوں، ان کو دور کرنا، ٹکسٹ بک کمیٹی اور بورڈ آف اسٹڈیز کی منظور کردہ کتابوں کو مذہبی، تاریخی اور ادبی نقطۂ نظر سے جانچنا، اردو اور انگریزی زبان کی تصانیف کا ایک کتبخانہ قائم کرنا، خوشی کی بات ہے کہ سابق وزیر تعلیمات مرحوم سر فخر الدین کی طرح حال وزیر تعلیم مولوی سید محمد حسین صاحب بھی اس مجلس کی سرپرستی فرمارہے ہیں،

لاہور کے صیغۂ مشرقیات کے اساتذہ تحسین و آفرین کے مستحق ہیں کہ وہ ہمارے علمی و ادبی ذخیرہ میں ہر سال کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے رہتے ہیں، پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی نے حکیم میر قدرت اللہ قاسم کا تذکرۂ شعرائے اردو (مجموعۂ نغز) بڑی محنت سے شائع کیا ہے، پروفیسر محمد اقبال نے اخبار الدولۃ السلجوقیۃ نام بنی سلجوق کی ایک عربی تاریخ تصحیح کرکے شائع کی ہے، اور عنقریب تاریخ الحکما بیہقی (تتمہ صوان الحکمۃ) پروفیسر محمد شفیع صاحب کی محنت و کوشش سے شائع ہونے والی ہے،

ابتک مسلمانانِ چین کے حالات میں پروفیسر آرنلڈ کی دعوت اسلام کے حصۂ چین کے سوا ہماری زبان میں کوئی کتاب موجود نہ تھی، حالانکہ چین کی اسلامی برادری کا علم ایک مدت سے ہم کو ہے، اب مسرت کی جگہ ہے کہ خود ایک چینی نوجوان اہل قلم نے جنکا اسلامی نام بدر الدین ہے، اور جو چھ سات سال سے ہندوستان میں تحصیل علم میں مصروف ہیں، اس کمی کو پورا کیا ہے، اور مسلمانانِ چین کے گذشتہ اور موجودہ حالات پر دو ڈھائی سو صفحوں کی ایک کتاب لکھ کر ہمکو اشاعت کی غرض سے دی ہے، نوجوان موصوف کلکتہ سے پہلے دار العلوم ندوہ لکھنؤ میں آئے، پھر انگریزی تعلیم کی غرض سے جامعہ ملیہ دہلی گئے، اور وہاں سے فراغت کرکے عربی ادب میں تکمیل و ترقی کی غرض سے پھر دار العلوم ندوہ میں مقیم ہیں، انھوں نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ عربی میں مضمون لکھ لیتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ اپنی اس کتاب کا عربی میں بھی خود ہی ترجمہ کریں،

لکھنؤ سے جو ماہوار اصلاحی واخلاقی و مذہبی رسالہ اصلاح نام نکالا گیا تھا، بحمد اللہ کہ وہ چھ مہینوں سے ابتک نکل رہا ہے، اور اپنی بعض خصوصیات کے لیے پسند کیا جا رہا ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان اسکی طرف توجہ کریں، اور اپنی خریداری اور امداد سے اسکے نوجوان اڈیٹر کی حوصلہ افزائی فرمائیں، رسالہ کی قیمت صرف تین روپے سالانہ ہے، اور پتہ رسالہ اصلاح، بادشاہ باغ لکھنؤ ہے،

یورپ میں لنڈن اور لائیڈن سے انگریزی، فرنچ اور جرمن میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے نام سے جو مسلسل اجزا ۱۹۱۳ء سے شائع ہو رہے ہیں، اور جو اب واؤ تک پہنچ چکے ہیں، اور جنمیں اسلام کے عقائد عبادات، فقہ، تاریخ اور مسلمان ملوک و سلاطین و حکما، و مصنفین غرض اسلامی علوم و فنون و تاریخ کے جملہ مباحث ہوتے ہیں مصر کے چند ارباب علم کی کوشش سے اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ء سے انکا عربی ترجمہ شروع ہوا ہے، محمد ثابت افندی سند یافتہ فلسفہ، واحمد الشنتناوی سند یافتہ فلسفہ و تاریخ ابراہیم زکی خورشید سند یافتہ تاریخ اور عبد الحمید یونس کے نام ترجمہ کی لوح اول پر ثبت ہیں، ابھی صرف اسکا پہلا جز شائع ہوا ہے، اور ہندوستان میں ابنا شرف الدین تاجرین کتب بھنڈی بازار بمبئی اسکے ایجنٹ ہیں، ہر دو ماہ میں اس کے چار جز (۶۴ صفحے) شائع ہوا کریں گے، اور ہر اشاعت دو ماہہ کی قیمت عیر ہوگی، شائقین علم اس کے لئے ابنا شرف الدین کے پتہ سے درخواستیں بھیجکر اسکے خریدار بن سکتے ہیں، مصر میں اسکے دفتر کا پتہ شارع قصر النیل نمبر ۲۳ ہے،

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے اکثر اجزا ر نظر سے گذرے ہیں، اور دار المصنفین انکا مسلسل خریدار ہے، یہ بات بے محابا کہی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں کے علوم و فنون و تاریخ پر یورپ کی تحقیقات جہانتک پہنچی ہے ان مباحث کا نچوڑ اور عطر ان اجزا میں کھینچکر رکھدیا گیا ہے، لیکن جہانتک مذہبی علوم و مباحث کا تعلق ہے افسوس ہے کہ ان میں بیحد غلطیاں ہیں، خصوصاً لے، جی ونسنک صاحب کی تحقیقات میں حمیت اور دانستہ شرارتوں کا طومار ہے، اور وہ اس انسائیکلوپیڈیا کے مؤلفین میں سے ایک ہیں، لیکن خوشی کی بات ہے کہ مصر کے اہل علم بھی انکی اس حیثیت سے بھی طرح واقف ہیں، چنانچہ مصر کی شاہی لغوی مجلس میں انکے شریک کیے جانے پر اختلافات برپا ہیں، انسائیکلوپیڈیا کے عربی مترجمین بھی اس کتاب کی اس کمزوری سے آگاہ ہیں، اور اسی بنا پر وہ علماء ازہر اور دیگر مسلمان اہل علم سے قابل اعتراض مواقع پر حواشی لکھوا کر کتاب میں شامل کر رہے ہیں۔

مقالات

سفر افغانستان

ممالک اسلامیہ کی سیر و سیاحت کے سلسلہ میں مدت سے آرزو تھی کہ کم از کم قریب ترین ہمسایہ اسلامی ملک افغانستان ہی کو دیکھ لوں، ۱۹۲۰ء میں جمعیۃ العلماء پشاور کی شرکت کے زمانہ میں دو دفعہ درۂ خیبر کی سیاحت کی ایکدفعہ اس مختصر سفر کے رفیق مولوی ظفر علیخاں صاحب اور مولٰنا سید حسین احمد صاحب تھے، اور دوسری دفعہ مولٰنا محمد علی اور جناب شعیب صاحب قریشی، دونوں دفعہ لنڈی کوتل کے قلعہ سے آگے بڑھنا نصیب نہ ہوا، پہلی دفعہ واپسی میں اتنی دیر ہوئی کہ شہر پشاور کا پھاٹک بند ہوگیا، اور رات جمرود کی سرائے میں قرونِ وسطیٰ کے مسافروں کیطرح بسر ہوئی، اور دوسری دفعہ لنڈی کوتل کے مشہور شنواری رئیس کے یہاں دن بھر قیام رہا،

اس اچٹتے ہوئے جلوۂ دیدار نے آتش شوق کو تیز تر کر دیا تھا، پچھلے ہی موسم گرما میں جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے "قابل شکست عہد" ہوا تھا کہ آیندہ سال افغانستان کی سیر کیجائے، ابھی اس گرمی پر پوری سردی آنے بھی نہ پائی تھی کہ خود "کوہِ طور" سے طلبِ دیدار کی صدا بلند ہوئی،

ڈاکٹر سر اقبال کا نوازش نامہ آیا کہ حکومتِ افغانستان نے مجھے، اور سر راس مسعود، اور آپ کو اپنے ہاں کے بعض علمی و تعلیمی مسائل میں مشورہ کی غرض سے بلانا چاہا ہے، کیا آپ چلنے کو تیار ہیں، میں نے جواب دیا کہ اس ملک کی جو خدمت مجھ سے بن آئے، میں اس کے لیے تیار ہوں، اس کے بعد، ر اکتوبر کو ہز اکسلنسی صلاح الدین سلجوقی جنرل قونسل افغانستان کا خط آیا، جسمیں اسی مطلب کا اظہار تھا، میں نے ان کو بھی اپنی آمادگی کی اطلاع دی، جنرل قونسل صاحب کی اصل تحریک تو یہ تھی کہ ہم لوگ ۱۳ اکتوبر کے جشن استقلال کے موقع پر کابل پہنچ جائیں، مگر اس قدر

جلد پاسپورٹ کا ملنا ممکن نہ تھا، اس لیے تاریخ کی تعیین کا مسئلہ پاسپورٹ کے ملنے کے بعد رفقار کے مشورہ پر موقوف رہا، توقع تھی کہ ۱۹/۱۰ اکتوبر کو پاسپورٹ مجھے مل جائیگا، اور ادھر سراس مسعود صاحب کو یونیورسٹی کی مشغولیتوں کے سبب سے جلد واپسی کی عجلت تھی، ۱۸ تک ان صاحبوں کو پاسپورٹ مل گئے، اور ۲۰ کو لاہور سے اور ۲۱ کو پشاور سے روانگی کا پروگرام بنگیا، اور وہ اسی کے مطابق روانہ ہوگئے، میری نسبت دفتری تحقیقات کا سلسلہ شروع ہوگیا، اور بالآخر ۱۸ کو نینی تال میں اس پر دستخط ہوئے، اور ۲۱ کو وہ اعظم گڈہ پہنچا، میں لکھنؤ چلا آیا تھا، دوسرے دن ایک آدمی کی معرفت پاسپورٹ لکھنؤ بھیجا گیا، جہاں وہ ۲۳ کی صبح کو پہنچا، اور میں اسی روز کے میل سے ۲ بجے پشاور روانہ ہوگیا، پشاور میں برادران عزیز حکیم عبد العزیز ندوی، اور حکیم عبد الجلیل ندوی، اور افغان مامور دیزہ (افغان پاسپورٹ آفیسر) عبد الغفور خانصاحب کو تار پہلے ہی دیدیا تھا، ۲۴ کی رات کو ۸ بجے کے قریب گاڑی پشاور سے ایک اسٹیشن پہلے نوشہرہ پہنچی، یہاں غیر متوقع طور پر حکیم عبد العزیز صاحب ندوی، حکیم عبد الجلیل صاحب ندوی، عبد الرحمان ندوی تاجر پشاور پہلے سے آکر موجود تھے، ان کی ملاقات سے بیحد خوشی ہوئی، ایک گھنٹہ کے بعد گاڑی پشاور پہنچی، گو کہ میری آمد کی اطلاع عام طور سے شائع نہیں ہوئی تھی، تاہم اسٹیشن پر نمایندگان حکومت افغان، متعدد احباب جمعیۃ العلماء سرحد اور بھارت سبھا کے چند ارکان موجود تھے،

شب بھر حکیم عبد العزیز صاحب کے نوتعمیر کاشانہ "امان منزل" میں بسر کی، صبح کو شہر کے بعض علماء، اور بعض قومی کارکنون نے ملاقات کی عزت بخشی، پنجاب کی طرح صوبہ سرحد میں بھی، شریعت کے مقابلہ میں رسم و رواج کو قانون کی حیثیت حاصل ہے، جب سے صوبہ سرحد میں کونسل کا قیام ہوا ہے، بعض پرجوش مسلمان کارکن اس کے لیے کوشان ہیں، کہ رسم و رواج کو توڑ کر شرعی احکام کی پابندی کا قانون منظور کیا جائے، ان صاحبون نے مجھ سے خواہش کی کہ افغانستان سے پشاور کو جب واپسی ہو تو اس اثنا میں یہاں مجلس شریعت کا اجلاس ہو اور میں اس میں شرکت کر دوں، چونکہ یہ خیال نہ تھا کہ واپسی کا راستہ بدلیگا، اس لئے میں نے قبول کر لیا،

یہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ پاسپورٹ ملنے کے بعد بھی، ابھی سفر کی سرکاری دقتیں ختم نہیں ہوئی ہیں، ابھی افغان

گورنمنٹ کے پاسپورٹ افسر کا دیزہ، اور صوبہ سرحد کے چیف سکریٹری کے دستخط باقی ہیں، جن سے سرحد کے عبور کرنے کی اجازت حاصل ہوگی، یہ کام بھی ختم ہوا، ۲۵ کی دوپہر کو برادرم حکیم عبد الجلیل صاحب ندوی کے یہاں دوپہر کا کھانا تھا، جسمیں شہر کے بعض علماء اور معززین شریک تھے، کھانے کے بعد ظہر کی نماز ادا کی، یہیں افغانستان لے جانے والا موٹر آگیا، یہاں سے حکیم عبد العزیز صاحب کے افغانی دواخانہ گیا، اور وہاں سے دوستوں سے رخصت ہو کر پشاور سے نکلا، غالباً ۳ بجے سہ پہر کا وقت تھا جب موٹر پشاور کے حدود سے باہر روانہ ہوا، میں نے سمجھا کہ اب عوائق سفر کا خاتمہ ہوا، مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد درہ خیبر کے دہانہ پر جمرود کی منزل آگئی، موٹر ایک دفتر کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا، یہاں برطانی محکمۂ آمد و رفت نے ہر شخص سے ایک ایک روپیہ اور موٹر سے چار روپے وصول کئے، اور رسید دیدی گئی، موٹر میں میں تنہا تھا، ساتھ ایک میرا ملازم اور دوسرا شوفر تھا،

اب ہم درۂ خیبر کے اندر داخل ہوگئے، دونوں طرف پہاڑیوں کا طویل سلسلہ اور بیچ میں درہ کا پُرپیچ راستہ تھا، حکومت انگریزی نے اپنے حدود تک سڑک نہایت عمدہ بنوائی ہے، درہ کا سب سے تنگ مقام مجھے وہ نظر آیا جہاں علی مسجد نام چھوٹی سی لیکن نہایت تاریخی مسجد بنی ہے، مسجد کے پاس چاے اور سبزی اور پھلوں کی چند دکانیں ہیں، اس مسجد تک ۲۶ء میں دو دفعہ پہلے بھی آچکا تھا، اور یہاں ایک نماز ادا کرنے کا شرف بھی حاصل ہو چکا تھا، اس وقت پھر اس مسجد پر حسرت کی ایک نگاہ ڈالی، پہلے افغانستان اور ہندوستان کے درمیان یہی مسجد حد فاصل تھی، لیکن اب انگریزوں نے اس سے بھی آگے بڑھکر اپنی سرحد قائم کی ہے،

اس درہ کے اوپر اسی کے ساتھ ساتھ خیبر ریلوے کی لائن بچھی ہے، جس کی تعمیر انگریزی انجنیرنگ کی حیرت انگیز کرامت ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر انگریزی سیاست کی سب سے بڑی کامیابی ہے، یہ ریلوے تقریباً ۱۸ میل تک اس طرح پھیلی ہے کہ کبھی پہاڑ کی چوٹی پر، اور کبھی وادی کے دامن میں، اور کبھی کسی پہاڑی کے سینہ کو بیچ سے چیرتی ہوئی نظر آتی ہے

بہرحال ان ہیبتناک مناظر سے گذرتے ہوئے ۴ بجے کے قریب لنڈی کوتل کی وسیع وادی میں قلعہ کے سامنے جاکر موٹر پھر رکا، میدان میں سپاہی ورزشی کھیلوں میں مصروف تھے، یہاں شوفر اور میرا ملازم قلعہ کے اندر گئے،

اور جمرود کی رسید اور پاسپورٹ جاکر دکھائے، جس کے بعد آگے بڑھنے کی اجازت ملی، اور موٹر نے پھر آگے کا رخ کیا، کچھ دیر کے بعد انگریزی سڑک کی صناعی ختم ہوئی، اور درہ کا فطری راستہ نمودار ہوا، اور یہیں انگریزی سرحد کا آخری دفتر قائم تھا، ایک پہاڑی کے اوپر بنگلہ میں درۂ خیبر ایجنسی کا دفتر تھا، شوفر اور ملازم نے جاکر یہاں پھر پاسپورٹ دکھائے، اور برطانی پاسپورٹ افسر نے EXAMINED کی مہر ثبت کی،

یہاں سے نکل کر چند قدم آگے بڑھے تھے کہ افغانستان و ہندوستان کی موجودہ سرحد کا بورڈ نظر آیا، جس پر انگریزی میں یہ لکھا تھا، کہ یہاں سے ہندوستان کی سرحد ہے، اور کسی کو بغیر صحیح پاسپورٹ کے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں، یہاں ریلوے لائنوں کے بیچ سے جانے والے راستہ پر جس طرح ریل آتے وقت پھاٹک یا کسی اور چیز سے راستہ بند کر دیا جاتا ہے، اسی طرح ایک لمبے ستون کو آڑا کر کے راستہ روک دیا گیا تھا، یہاں دونوں طرف کے سنتری کھڑے رہتے ہیں، اور ادھر کے جانے والے، اور ادھر کے اور ادھر سے آنیوالے ادھر کے سرحدار کے سپاہیوں کی اجازت سے اس روک کو اٹھا دیتے ہیں، اور مسافر پار ہو جاتے ہیں، چنانچہ حسب دستور سنتری نے برطانی سرحد داری کے سپاہی سے جو پچھلے بنگلہ کے پاس کھڑا تھا، ہاتھ کے اشارہ سے دریافت کر کے روک کو دور کیا اور موٹر دفعۃً غلام ملک سے نکل کر آزاد ملک میں داخل ہوگیا،

یہی مقام تورخم کہلاتا ہے، اور جواب افغانی و ہندی سرحد ہے، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ درہ کا جتنا حصہ زیادہ پر پیچ اور مشکل ہے، جنگی اور سیاسی مصلحتوں کی بنا پر برطانی حکومت نے اپنے قبضہ کو وہاں تک بڑھا دیا ہے، اب اسکے بعد درہ نسبۃً پھیلنا شروع ہوتا ہے، راستہ بالکل فطری حالت میں ہے، البتہ کہیں کہیں پتھروں کو بیچ سے ہٹا دیا گیا ہے، اور نشیب و فراز کو برابر کر دیا گیا ہے، اس سرحد سے چند قدم کے فاصلہ پر ایک پہاڑی کے اوپر افغان حکومت کی پہلی چوکی تورخم نامی واقع ہے، اس کے نیچے پانی کا چشمہ سا بہتا ہے، اور ایک مختصر سے باغ یا چند درختوں کے جھنڈ کے سایہ میں خالی زمین مسجد کا کام دیتی ہے، یہاں وضو کر کے عصر کی نماز ادا کی، اور افغان افسر نے پاسپورٹ دیکھکر راہداری کا محصول چار روپیہ وصول کیا۔

اب ہم افغان علاقہ میں چل رہے تھے، درہ کا راستہ کشادہ ہوتا جا رہا تھا، پاس کی پہاڑیاں دور ہٹتی جا رہی تھیں، ۵ بجے کے قریب افغانی مشرقی سرحدداری کے پاس پہنچ گئے جسکا نام ڈکہ ہے، یہاں وادی وسیع ہے، اور سامنے دریائے کابل کی نہایت کم چوڑی آب رواں کی چادر پھیلی ہوئی نظر آئی، ایک طرف افغانی سرحدار کا مغربی طرز کا بنگلہ تھا، دوسری طرف کچی دیواروں کی عمارت کا ایک پھاٹک تھا جو افغانی سرحدداری کا دفتر تھا، یہاں شوفر اور ملازم نے لیجاکر پاسپورٹ دکھائے، اور وہاں اس پر "بسرحدداری درمشرقی ملاحظہ شد برائے رفتن کابل" کی اجازتی مہر لگائی گئی، اور خبر دی گئی کہ یہاں شاہی مہمان کی حیثیت سے افغانی سرحدار صاحب سے میری معرفی کرائی جائے گی، مگر وہ بیمار تھے، اندر سے باہر آنے کے انتظار میں تاخیر کا اندیشہ تھا، اس لئے معافی مانگ کر آگے بڑھنے کی اجازت چاہی، افغان سپاہی نے روک کی زنجیر ہٹائی اور موٹر آگے روانہ ہوا۔

اب قریب شام کا وقت آگیا تھا، پٹھان مسافر مرد و عورت، بچے اور بوڑھے آجا رہے تھے، اونٹ گدھے، گائے بیل، بھیڑیں، چراگاہوں سے واپس آرہی تھیں، درۂ خیبر کے شروع سے لیکر یہاں تک دیہاتی پٹھان خواتین سر سے پاؤں تک سیاہ کپڑوں میں مستور کھلے منھ بڑی آزادی سے آجا رہی تھیں، بدن پر گھٹنوں تک سیاہ کرتے، پاؤں میں بڑے گھیر کی عموماً سیاہ شلواریں، سر سے پاؤں تک سیاہ چادریں، ہر قسم کے زیور اور ظاہری آرائش سے تمامتر پاک، ان کو دیکھکر خیال ہوتا تھا کہ شاید اصل سادہ اسلامی پردہ یہی ہوگا،

ڈکہ سے آگے نکلے تو پہلی افغانی چھاؤنی نظر آئی، خیمے کھڑے تھے، سپاہی اپنی خاکی وردیوں میں چل پھر رہے تھے، ان خیموں سے ذرا ہٹکر ان کے باورچی خانہ کا خیمہ نظر آیا، ان سپاہیوں کی وردی یہ تھی، خاکی پتلون خاکی کوٹ، سر پر خاکی ٹوپی، جس کے آگے ہیٹ کی طرح چھجا نکلا ہوا، مصری سپاہیوں کی بھی اسی قسم کی وردی ہے، مگر اُن کے سر پر ترکی ٹوپی رہتی ہے، جس کے اوپر ایک خاکی غلاف چڑھا ہوتا ہے، اور اسی کپڑے کا آگے ہیٹ کی طرح چھجا نکلا ہوتا ہے، جس سے مقصد آنکھوں کے سامنے دھوپ کی تمازت کو روکنا ہوتا ہے،

اب شام ہو چکی تھی، اور موٹر سناٹے کے عالم میں پوری تیزی سے دوڑ رہا تھا، کبھی کبھی پٹھان کاشتکار دو

کابل یا خانہ بدوش مسافروں کا کوئی مختصر قافلہ مل جاتا تھا، جس کے ساتھ مویشیوں کا گلہ، بار برداری کے جانور یہاں تک کہ کسی بیل یا گدھے کی پیٹھ پر مرغیاں بھی بیٹھی نظر آتی تھیں، وادیوں میں کہیں کہیں کھیت بھی تھے، یکے بعد دیگرے افغانی چوکیاں بھی گذریں، جنکے مکانات خام دیواروں کے تھے،

درۂ خیبر سے لیکر ادھر خام مکانات کا رواج عام طور سے ہے، اور غالبًا اس سرزمین کی آب و ہوا کا اثر ہے کہ اس قسم کے مکانات بارش میں محفوظ رہتے ہیں، ادھر بارش تو کم ہوتی ہے، یہاں کی سیرابی اور سرسبزی زیادہ تر برف کے پگھلنے سے جو چشمے جاری ہوتے ہیں، انہی سے ہے، واپسی میں ملتان میں بھی اسی قسم کے مکانات دیکھے، کابل وغزنین وغیرہ مین بھی ایسے مکانات نظر آئے، بلکہ تعجب ہوتا تھا کہ قلعے اور دھس اور شاہی عمارتین بھی اسی خام مٹی کی ہوتی ہیں، یہ مٹی نہایت چکنی اور لسدار ہے، کھگل کے بعد یہ دیوارین بڑی مستحکم ہوجاتی ہیں، قلعوں میں کئی کئی گز کی چوڑی دیواریں ہوتی ہیں، اور ان میں ہر کونے پر مٹی ہی کی برجیاں بنی ہوتی ہیں، دیواروں میں بندوقوں کے لئے بیشمار سوراخ ہوتے ہیں،

درۂ خیبر میں اور دوسرے آزاد سرحد میں ہر خاندان یا قبیلہ کا اسی قسم کا الگ الگ قلعہ ہوتا ہے، جو ہر ایک کو دوسرے کے حملوں سے بچاتا ہے، اس چھوٹے سے قلعہ کا سردار ملک کہلاتا ہے، جمرود سے لیکر لنڈی کوتل تک اور اس کے بعد بھی اس قسم کے ملکوں کے قلعے بعض مسمار بعض کھڑے، بکثرت نظر آتے ہیں، اسی قسم کی افغانی چوکیاں راستوں میں ملیں، جنمیں سے بعض اچھی خاصی بلند تھیں، اور سپاہی سیڑھیوں سے چڑھ اور اُتر رہے تھے، چونکہ رات ہوگئی تھی اس لیے خیال تھا کہ ایسا نہ ہو کہ کسی چوکی پر ہم کو روکدیا جائے، مگر ڈکہ کے سرحددار سے کہکر ٹیلیفون سے نہ روکنے کی ہدایت کرادیگئی تھی،

اب رات کے ۸ بج چکے تھے، چاندنی چھٹکی تھی، ہر طرف پہاڑوں کی دیوارین نظر آتی تھین کہیں کہیں پتھروں سے چشمے بہ رہے تھے، انسانوں اور انسانی آبادیوں کا نشان میلوں تک نظر نہیں آتا تھا، گرم رفتار موٹر کی آواز کے سوا ہر طرف سناٹا تھا، اسی اثنا مین ایک پل آیا، جو گو نیا بنا تھا، مگر ابھی استعمال میں نہیں آیا تھا، نیچے چشمہ بہہ رہا تھا، ڈرائیور

نے موٹر کو نیچے اتار کر چشمہ کے اندر سے گذر کر اوپر چڑھنا چاہا، انجن چشمہ کے سرد پانی سے بھیگکر خاموش ہوگیا، اب بار بار انجن کو ہینڈل کرکے متحرک کرنے میں کچھ دیر لگی، باوجود اس خاموشی تنہائی اور لق و دق میدان کے فضا میں امن و امان کا اطمینان چھایا تھا، اور جس سے یہ نتیجہ نکلا کہ بحمد اللہ ملک میں مسافروں کو ہر گونہ امن و امان اور اطمینان حاصل ہے، اور یہ ملک کی سب سے بڑی خوش قسمتی ہے،

چند جھٹکوں کے بعد انجن گرم ہوکر پھر متحرک ہوا، اور اوپر چڑھکر اس منزل کو طے کیا، اب جلال آباد قریب تھا، سڑک سیدھی اور صاف تھی، دو رویہ درختوں کی صفین تھین جنکو ختم کرنے کے بعد ہم کو جلال آباد کے چراغ نظر آنے لگے، اور بالآخر آبادی آئی، اور ہم باغِ شہید نام سرکاری مہمانخانہ میں جاکر اترے، سیڑھی پر مامور صاحب استقبال کے لئے کھڑے تھے، باغ کے اندر یہ ایک بڑی عمارت تھی، جسمین متعدد کمرے آراستہ اور مہمانون کے لئے تیار تھے، انھیں میں سے ایک کمرہ میں اتارا گیا، مسہری اور اس پر صاف بستر اور کمل قرینہ سے لگے تھے، کمرہ میں میز کرسی، آرام کرسی ہر چیز تھی،

اس اکتوبر میں جلال آباد کا موسم پشاور کے برابر سرد تھا،

یہاں پہنچکر پہلے ہاتھ منھ دھوکر وضو کرکے مغرب اور عشاکی یکجا مسافرانہ نمازیں ادا کیں، تھوڑی دیر میں کھانا آیا، کھانے کے بعد کابل کا مشہور سردہ اور انگور آئے، سردہ اتنا میٹھا اور ساتھ ہی اتنا سرد تھا کہ وہ اس ٹھنڈک میں کھایا نہ گیا، رات بھر آرام کیا، صبح اٹھکر نماز کے بعد باغ کی سیر کی، کس قدر پر لطف سماں تھا، باغ کی پشت پر پہاڑیاں تھیں، پہاڑیوں کے دامن مین دریاے کابل یا کوئی اور چشمہ آہستگی سے بہ رہا تھا، ایک چشمہ کسی طرف سے آکر باغ کی روش کے کنارے کنارے رواں تھا، روشوں پر ہر دو طرف چنار کے لمبے لمبے درخت کھڑے تھے، یہ مہینے افغانستان میں موسم خزاں کے ہوتے ہیں، وہاں خزاں میں پتے خشک ہونے کے بجاے زرد ہوجاتے ہیں، ہر طرف زرد زرد پتوں کی ایک دوسری بہار رنمودار تھی،

جلال آباد کے اس باغ کا نام میں نے باغِ شہید سنا، شاید اس لیے کہ امیر حبیب اللہ خان شہید نے

اس کو بنوایا ہے، باغ کی عمارت کا طرز ہندوستان سے جدا تھا، بلند کرسی تھی جس کے بعد برآمدہ، برآمدہ کے بیچ کے راستہ سے ایک بڑے وسیع ہال میں داخل ہو جاتے تھے، اس پورے ہال کے اوپر چھت کے بجائے گنبد، دونوں طرف کمرے، اس ہال کے پیچھے بلند سائبان جس کے نیچے ایک مختصر وادی، جس میں پانی کی روانی اور سامنے مذکورہ بالا پہاڑیاں، اس باغ کی تعمیر کی نسبت گو امیر حبیب اللہ خان کی طرف سنی، مگر بڑے ہال کے بلند دروازہ کے اوپر ایک پتھر نصب تھا جس پر کتبہ لگا تھا، میں نے اس کتبہ کو پڑھنے کی کوشش کی، مگر افضل خاں کے نام کے سوا کچھ اور نہ پڑھا گیا،

میں نے سنا تھا کہ بچہ سقہ کے ہنگامہ میں جلال آباد اور اس کی سرکاری عمارتوں کو بہت نقصان پہنچا تھا، اس کی ایک شہادت میں نے یہ پائی کہ باغ مذکور کے برآمدہ میں جو دروازے اور کھڑکیاں لگی تھیں، ان کے شیشے نہ صرف ٹوٹے تھے، بلکہ اُن کی لکڑیوں کو آگ سے جلائے جانے کی کوشش کی علامتیں موجود تھیں،

افغانستان کی آبادیوں کے مکانات کی چھتیں خام اور منڈیر کے بغیر، اور سپیدی یا گچ کے بجائے مٹی سے باہر سے لپے ہوئے ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی عمارتوں کے دیکھنے کی عادی نگاہوں کو وہ پر رونق نہیں معلوم ہوتی ہیں مسجدیں بھی عموماً خام دیواروں کی اور گنبد و منار سے خالی ہوتی ہیں، اس لیے وہ دور سے ممتاز نظر نہیں آتیں اور اسی لئے باہر کے سیاحوں کو یہ آبادیاں آباد اور دلکش نہیں معلوم ہوتیں، حالانکہ وہ مکانات اندر سے بہت عمدہ آراستہ اور خوبصورت ہوتے ہیں، موجودہ شہر جلال آباد کی بھی یہی کیفیت تھی، مسافروں کے لیے ہوٹل یا کھانے کی دکانیں ہیں، چائے کے روسی سماور ہر جگہ گرم نظر آتے ہیں، یہیں سے چند میل کے فاصلہ پر ہڈا ایک گاؤں ہے، جہاں کے مشہور مجاہد عالم ملا ہڈا کے نام سے ہندوستان کے انگریزی اور ہندوستانی اخباروں میں آج سے بیس برس پہلے بہت نامور تھے، اور جو انگریزی فوجوں سے بارہا برسر پیکار ہو چکے تھے، ان کا سرکاری خطاب نجم المشائخ تھا، جس کی نسبت سے اُن کے مدرسہ کا نام جو اُسی ہڈا میں واقع ہے، نجم المدارس ہے، اور میں نے کابل کے ایک صاحب علم سے سنا کہ وہاں ملا صاحب کا متروکہ بہت اچھا خاصہ کتبخانہ ہے، یہ مدرسہ پرانے طرز کا عربی مدرسہ ہے،

ماموں صاحب جلال آباد نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جلال آباد کے آس پاس بودھ لوگوں کی بکثرت سنگی یادگاریں ہیں،

جلال آباد پشاور سے انسی میل ہے، اور کابل پشاور سے دو سو میل پر واقع ہے، آج ایک سو بیس میل طے کرنے تھے، صبح کو آٹھ بجے جلال آباد سے آگے بڑھے، سڑک اچھی، اور کچھ دور تک نئی بنی تھی، پل بھی مرمت ہو رہا تھا، کہیں کہیں سڑکوں کی درستی بھی ہو رہی تھی، پٹھان مزدور کام پر لگے ہوئے تھے، اونٹوں اور گدھوں پر لدے ہوئے خانہ بدوش قبیلے، اور کہیں کہیں ہل چلانے والے کاشتکار اپنے بیلوں کے ساتھ نظر آتے تھے، جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، راستہ زیادہ سنگلاخ ہوتا جا رہا تھا،

جلال آباد سے تھوڑی دور چل کر سب سے پہلی بڑی آبادی نملا نامی آئی، یہاں ایک وسیع شاہی باغ ہے جس میں سرکاری مہمانخانہ بھی ہے، باغ میں ہر طرف درختوں کی رونق تھی، روشوں پر چنار اور آملہ کے درخت لگے تھے، گو راستہ دوسری طرف سے تھا، لیکن ہم نے باغ کے دیکھنے کی خاطر باغ کے اندر سے ہو کر راستہ اختیار کیا، اسکو ایک نظر دیکھتے ہوئے آگے نکل گئے، قصبہ میں کاشتکاروں کی آبادیاں تھیں، اور دوسرے باغ ادھر ادھر لگے تھے،

افغانستان میں پہلے جب موٹروں اور لاریوں کی سواریاں رائج نہ تھیں، اور عموماً لوگ گھوڑوں یا اونٹوں پر سفر کرتے تھے، تو عموماً ہر بارہ تیرہ میل پر پڑاؤ ہوتا تھا، اور ہر پڑاؤ پر سرکاری عہدہ داروں اور مہمانوں کے قیام کیلئے مکانات بنے تھے، جنہیں تمام سرو سامان مہیا رہتے تھے، اب موٹروں کی گرم رفتاری نے منزلوں کو دور تر کر دیا ہے، اب انسی میل، سو میل، سوا سو میل پر یہ مکانات بالکل جدید فرنیچر اور ساز و سامان کے ساتھ موجود ہیں، تاہم مسافر ابھی تک انھیں پرانی منزلوں کا حساب لگاتے ہیں، اور ان کی فارسی میں ہمارا ہندوستانی لفظ "پڑاؤ" پوری آزادی سے مستعمل ہے، اور فاصلہ بتاتے وقت مسافت کی تعیین "یک پڑاؤ"، "دو پڑاؤ" سے کیجاتی ہے، میل کے بجائے اُن کے ہاں "کروہ" کا پرانا ہندوستانی فارسی لفظ جاری ہے، جس کو ہم ہندی "کوس" کا مرادف کہہ سکتے ہیں، اور جو تقریباً پونے تین انگریزی میل کے برابر ہوتا ہے، اب جدید سڑکوں کی تعمیر میں فرنچ اصطلاحات میٹر، سینٹی میٹر اور کیلو میٹر کا رواج ہو رہا ہے،

یہاں سڑکوں پر میلوں کے نشانات نہیں لگے ہوئے ہیں، اس سے مسافروں کو مسافتوں کے جاننے میں

دقتیں پیش آتی ہیں، اگر ملک کی وزارت امور نافعہ اس کی طرف توجہ کرے، تو یہ ذرا سی اصلاح مسافروں کی بڑی الجھن کو دور کردے،

نملا سے آگے بڑھکر شاید ایک آدھ گھنٹہ میں، ہم فتح آباد پہنچ گئے، یہ جلال آباد سے اٹھارہ میل پر ہے، اور کہا جاتا ہے کہ یہ پشاور اور کابل کے ٹھیک بیچ میں واقع ہے، یہ بھی ایک قصبہ سا ہے، مختصر سا بازار ہے، جس میں مسافروں کے کھانے پینے کی چیزیں اور سبزیاں ملتی ہیں، چائے خانے مع گرم سماوروں کے کئی موجود ہیں، اب جبکہ کابل اور پشاور کے درمیان مسافروں کی اور اسباب کی لاریاں اور ٹیکسی گاڑیاں بکثرت آتی جاتی ہیں، اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر تھوڑے فاصلہ پر ان کے لئے تیل اور ان کی درستی کے مختصر سامان موجود رہیں، چنانچہ صوبہ سرحد کے ایک مسلمان تاجر نے افغانی سرکار سے اس کا ٹھیکہ لیا ہے، ان کی پہلی دکان تو ڈکہ میں ملی تھی، جہاں پانی پت کے ایک مسلمان نوجوان نوکر تھے، دوسری دکان فتح آباد میں ملی، دکان کی عمارت نئی بنی تھی، عمارت کے نیچے زمین دوز کمرہ تیلوں کا گودام تھا،

نملا کے آس پاس کھیت ہیں، جنہیں افغانی کاشتکار اس وقت ہل چلا رہے تھے، یہ ہل ہندوستانی ہلوں کے مشابہ تھے، اس ملک میں کھیتوں کی سیرابی چشموں اور نہروں کے پانی سے ہوتی ہے، یہ چشمے اور نہریں فطرۃً نشیب میں، جدھر جدھر گھومتی ہیں زمین کو شاداب اور سرسبز بناتی جاتی ہیں، اور وہاں آبادیاں قائم ہو جاتی ہیں، کچھ دنوں کے بعد جب ان کا رخ کسی اور طرف ہو جاتا ہے تو یہ آبادیاں بھی ادھر منتقل ہو جاتی ہیں، اس انتقال مکانی کی ٹوٹی پھوٹی یادگاریں جا بجا ملتی جاتی ہیں،

سیرابی کا طریقہ یہ دیکھا کہ کاشتکار کفگیر کی طرح کی لکڑی کا کوئی آلہ (ڈوا) ہاتھ میں لیکر نہروں سے پانی اچھال اچھال کر کھیتوں میں چھترا کر پھینکتے ہیں، افغانستان کے بڑے بڑے شہروں میں سڑکوں پر پانی چھڑکنے کا طریقہ بھی یہی دیکھا، سڑکوں کے دونوں طرف چشمے بہ رہے ہیں، میونسپلٹی کے ملازم جو سڑکوں کی صفائی کے لئے مامور ہیں، وہ اسی طرح سے چشموں سے پانی اچھال اچھال کر سڑکوں کو تر کرتے ہیں، تاکہ گرد و غبار بیٹھ جائے،

جلال آباد سے فتح آباد تک سڑک کی سنگلاخی ایسی ہے کہ موٹروں کو سخت ہچکولے پڑتے ہیں، ہمارا موٹر گو زیادہ مستعمل نہ تھا، مگر اس کے ایک پہئے کے نیچے کی ایک کمانی ٹوٹ گئی، فتح آباد کی تیل والی دکان میں پہنچکر موٹر میں جب تیل ڈالا جانے لگا تو اس ٹوٹی کمانی پر نظر پڑی، بڑی مشکلوں سے وہاں لوہے کی ایک لمبی سلاخ کا ٹکڑا ملا، جس کو ٹیڑھا کرکے، لوہے کے تار سے باندھکر اس کمانی کی مرمت کیگئی، جسمیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے لگ گئے، اس دکان کے ملازم بھی ہندوستانی تھے، انھوں نے چائے سے تواضع فرمائی، انھیں نے مجھے بتایا کہ یہاں سے چھ میل پر ایک مزار ہے، جسکی نسبت یقین کیا جاتا ہے کہ وہ حضرت لوطؑ کی قبر ہے، اور لوگ اسکی زیارت کو جاتے ہیں،

یہاں کچھ بچے قرآن پاک اور پرانی گلستان و بوستان اور کسی فارسی نظم کے سبق پڑھتے نظر آئے، انکے گاکر پڑھنے کی خاص لے تھی، جو مجھے تو بہت خوش آیند معلوم ہوئی،

۱۱ بجے کے قریب موٹر کی مرمت ختم ہوئی، اور ہم آگے بڑھے، راستہ اوسی طرح دشوار گذار سنگلاخ اور پُرپیچ تھا، ہم کو کابل پہنچکر وزرائے حکومت سے معلوم ہوا کہ موجودہ حکومت نے کابل اور پشاور کے درمیان ایک اور سڑک کا کام شروع کیا ہے، جو نسبتہً اس سے کم دشوار گذار ہے اور ساتھ ہی اس راستہ سے کابل اور پشاور کے درمیان پچاس میل کی مسافت کم ہو جائیگی، اور امید ہے کہ اس سڑک کی تیاری کے بعد ہندوستان و افغانستان کی آمد و رفت، اور تجارتی کاروبار میں بہت بڑی ترقی ہو جائے گی، میرے خیال مین پشاور سے جلال آباد کو وہی نسبت ہے جو چمن اور کوئٹہ سے قندھار کو ہے، مگر قندھار کے بازاروں میں جو رونق اور آبادی اور دکانوں کی کثرت نظر آتی ہے، وہ جلال آباد کو نصیب نہیں، حالانکہ جلال آباد پشاور سے صرف اسی میل ہے، اور اسی بنا پر جلال آباد مین تجارتی ترقی کی بہت بڑی صلاحیت موجود ہے، کہ افغانستان و یاغستان اور دیگر مشرقی کوہستانوں کے درمیان یہی ایک شہر تجارت کا مرکز بن سکتا ہے،

فتح آباد سے چل کر ڈیڑھ بجے دن کو ہم گو لال نامی قصبہ مین پہنچے، آبادی گو مختصر مگر مشغول معلوم ہوئی، چھوٹا سا بازار بھی ہے جسمین دن رات کی ضرورت کی چیزیں ملتی ہیں، کھانے کی کئی دوکانیں تھیں، یہاں سے کابل تک

بھر کوئی ایسا مقام نہ تھا، اس لیے یہاں کھانے کا انتظام کیا گیا، اس دوکان کو ہوٹل تو نہیں کہہ سکتے، گو یہاں اس کا یہی نام ہے، ہاں باورچی کی ایک ستھری دوکان کہہ سکتے ہیں، ایک طرف میرے لیے اس نے میز اور کرسی لگا دی، اور اوپر کھانا رکھدیا، پشاور سے جو افغانی روٹی شروع ہوتی ہے، وہی پورے افغانستان میں ملتی ہے، چپاتیوں کا رواج نہیں، دنیا کے اکثر ملکوں کی طرح یہاں بھی گھروں میں روٹیاں بازاروں سے پک کر آتی ہیں، یہ بڑی قسم کی تنوری روٹی ہوتی ہے، روٹی، مرغ، انڈے اور فیرنی کے تین کھانے، اور کافی کی تین پیالیاں میرے اور شوفر اور ملازم کے لیے تھیں، مگر اس ارزانی کو سنکر آپ حیرت زدہ ہونگے، کہ اُن کی مجموعی قیمت انگریزی سکہ کے حساب سے صرف ایک روپیہ ایک آنہ تھی،

ملک افغانستان کے اندر اب تک شاید سوا سو میل کے قریب ہم طے کر چکے تھے، مگر اب تک کسی مسجد کے منارے نگاہ سے نہیں گذرے تھیں، یہاں اگر یک بیک خیال ہوا کہ کیا یہ پورا اسلامی ملک مسجدوں سے خالی ہے؟ میں نے دکاندار سے دریافت کیا کہ یہاں کوئی مسجد ہے، اس نے سامنے کے بلند چبوترہ کی طرف اشارہ کیا، ظہر کا وقت تھا وہاں گیا تو دیکھا کہ قصبہ کی سب سے اونچی جگہ پر مٹی کا ایک چبوترہ ہے، اسی کے ساتھ ایک چھوٹا سا دالان ہے، دالان میں صرف ایک دروازہ تھا، اس کو کھولکر دیکھا تو دیوار میں امام کی جگہ کے لیے محراب بنائی گئی تھی، اور خطیب کے لئے بغل میں ایک دو زینہ کا چبوترہ تھا، اب سمجھ میں آیا کہ چونکہ یہاں کی ان مسجدوں میں گنبد اور منارے نہیں ہوتے، اسی لیے وہ اجنبیوں کو مسجدیں نہیں معلوم ہوتیں،

بہرحال مسجد میں ظہر اور عصر کی یکجا نماز ادا کرکے ۳ بجے کے قریب آگے چلے، اب ہم جیسے جیسے آگے بڑھتے جاتے تھے، راستہ کا پیچ و خم اور نشیب و فراز بڑھتا جاتا تھا، راستہ کیا، پہاڑوں کے بیچ سے اور کبھی ان کے ادھر سے اور کبھی ادھر سے، پہاڑوں کو بچا بچا کر وہ نکالا گیا ہے اور جو اس قدر کم چوڑا ہے کہ دو موٹریں بمشکل چل سکیں ان کے نیچے ہر قدم پر عمیق غار، کھڈ، یا چشمہ، اگر ڈرائیور ایک سکنڈ کے لیے بھی غفلت کرے تو موٹر اور سواریوں کی ہڈیوں تک کا بھی کہیں پتہ نہ چلے، پہاڑی راستوں کا پیچ و خم اس قدر ہے کہ ہر موڑ پر یہ ڈر لگتا تھا کہ کوئی لاری یا

موٹر ادھر سے آئے تو ٹکرا نہ جائے، اور واقعہ یہ ہے کہ اگر واقف کار اور مشاق ڈرائیور نہ ہوں تو بسلامت پہنچنا مشکل ہے، اس پست و بلند اور ناہموار راستہ کو دیکھکر سعدی کی درویشانہ کیفیت کا شعر یاد آتا تھا،

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم،
گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم،

الغرض ان خطرناک نشیب و فراز اور زیر و بالا اور چڑھاؤ اُتار راستوں کو طے کر کے مغرب کے بعد ہم اس مقام پر پہنچے جہاں دریائے کابل میں بند باندھا گیا ہے اور پانی بلندی سے نیچے گرتا ہے، اس کے پاس ہی قرینہ کی ایک آبادی آئی، جسکا نام شاید خاک جبار ہے، اور اس کے بعد دور تک راستہ اس طرح ہے کہ اوپر پہاڑی دیوار، نیچے سڑک اور اس کے نیچے پتھروں سے الجھتا اور نشیب و فراز سے ہاتھا پائی کرتا ہوا چشمہ نما دریا کا پانی بہ رہا ہے، اس وقت بھی کابل سے سرِ شام چلنے والی لاریاں سامان و اسباب اور مسافروں سے بھری ہوئی، راستہ میں ملتی جاتی تھیں، آخر مغرب کو شاید کابل سے ۵ا میل پہلے، بت خاک پہنچے، یہ گویا کابل کا پھاٹک ہے، پرانی وضع کا اچھا خاصہ بازار ہے، آمد و رفت کی کثرت بھی تھی، یہاں سرِراہ ایک مکان کے سامنے موٹر رکا، معلوم ہوا کہ یہاں کابل جانے کا محصول چنگی وصول ہوتا ہے، یہاں سے کابل کا سیدھا راستہ ہے، سڑک چوڑی، ہموار اور صاف، سڑک کے دونوں طرف چشمے بہ رہے تھے، اور ان کے نیچے غالبًا چنار کے درخت دو رویہ لگے تھے، جیسے جیسے شہر قریب آتا جاتا تھا روشنی کی رونق بڑھتی جاتی تھی، اب شہر کابل کا چنگی خانہ آیا، یہاں موٹر کا نمبر، ڈرائیور کا نام، مسافر کا نام وغیرہ درج کیا گیا، یہیں ٹیلیفون آیا کہ حکومت کی طرف سے چند نمایندے استقبال کے لئے آرہے ہیں، چند منٹ انتظار کیا جائے، انتظار کو کچھ ہی منٹ گذرے تھے کہ پیچھے سے ایک تیز رفتار شاہی موٹر آکر رکا، اور اس سے چند اصحاب اترے، جنمیں سے ایک وزارت خارجیہ کے اور دوسرے صاحب وزارت تعلیم کے نمایندے اور ایک دو اور بزرگوار تھے، انھوں نے خوش اخلاقی سے مصافحہ کیا اور اپنی اپنی وزارتوں کی طرف سے خوش آمدید اور مہمان نوازی کے الفاظ ادا فرمائے، اور مجھے اپنی کار میں لے کر شہر میں داخل ہوئے،

رات کا وقت تھا، شہر کے اکثر حصے بجلی کی روشنی سے منور تھے، بعض حصوں کی عمارتیں اچھی خاصی بلند اور شاندار، اور سڑک صاف و ہموار تھی، پولیس کے سپاہی اچھی خوشنما وردیوں میں آمد و رفت کے نظم و نسق کیلئے کھڑے تھے، پرانے کابل سے گذر کر ہم کابل کے نئے شہر میں پہنچے، اور دار الامان میں لائے گئے، جس کو امیر امان اللہ خاں نے اپنے زمانہ میں جدید طریق پر آباد کرنا چاہا تھا، یہاں یورپین انجنیروں کی نگرانی میں جدید طرز و انداز کی پانچ چھ سرکاری عمارتیں بنی ہوئی ہیں اور ہر عمارت کئی کئی منزل کی ہے، انھیں عمارتوں سے ایک شاندار عمارت شاہی مہمانخانہ ہے، اسی مہمانخانہ کے سامنے آکر موٹر رکا، اور ہم سب اتر کر باغ کے اندر داخل ہوئے، اس باغ کے پھاٹک پر وہ جناب ملے جو ہم نوواردوں مہمانوں کی خاطر مدارات اور دیکھ بھال کے لیے مقرر تھے، ان کا نام سرور خاں اور گویا تخلص ہے، یہ امیر عبد الرحمن خاں مرحوم کے زمانہ کے مشہور سردار عبد القدوس خاں کے پوتے ہیں، اکیس تیس کے درمیان عمر ہوگی، یہ فارسی کے علاوہ عربی اور انگریزی بھی جانتے ہیں، شعر و شاعری کا بہت اعلیٰ مذاق رکھتے ہیں، فارسی میں کم کوئی اچھا شعر ہوگا جو ان کو یاد نہ ہو، شعر العجم اور میرزا مظہر کے خریطۂ جواہر کے تمام منتخب اشعار ان کی نوک زبان ہیں، اندازہ ہے کہ پچیس تیس ہزار شعر ان کو یاد ہونگے، اخلاق پسندیدہ، اطوار شائستہ، ذہن رسا، مذاق عالی، تذکروں کے حافظ، اور قلمی کتابوں کے جویا، فارسی تحریر کا بہت سلیقہ رکھتے ہیں، کابل کی شاہی انجمن ادبی جسکو رائل اکاڈیمی کہنا چاہئے، اور جسکو موجودہ حکومت نے قائم کیا ہے کے رکن ہیں، رسالہ کابل[1] میں ان کے مضامین چھپا کرتے ہیں،

سرور خاں نے جیسے ہی اپنا نام بتایا، میں نے عرض کی "در کابل دیدہ بودم واکنوں در کابل می بینم" انھوں نے اس فقرہ سے مزا لیا، اور مجھے ساتھ لیکر مہمان خانہ کی دوسری منزل پر لے گئے، جہاں ہمارے پیشرو رفیقوں کا قیام تھا، اور اس کا ایک کمرہ میرے لیے مخصوص تھا، یہاں سب سے پہلے مدیر صاحب مہمانخانہ سے تعارف کرایا، پھر ڈاکٹر اقبال اور نواب سر راس مسعود سے جا کر ملا، سر راس مسعود کیساتھ پروفیسر ہادی اور ڈاکٹر سر اقبال کیساتھ غلام رسول خاں بیرسٹر لاہور سکریٹری ہو کر آئے تھے، ان سے ملاقات ہوئی، پروفیسر ہادی میرے پرانے دوست ہیں، ان سے بارہ برس کی ملاقات ہے، نواب محسن الملک مرحوم کے بھتیجے ہیں، پہلے سائنس کے لیے انگلستان گئے تھے، پھر واپس آکر جامعہ ملیہ

[1] پہلے کابل سے رسالہ کابل اور دوسرے سے شہر کابل مراد ہے،

میں رہے، وہاں سائنس کلاس کو ترقی دی، پھر مسلم یونیورسٹی میں چلے گئے، فارسی ایک حیثیت سے ان کی مادری زبان ہے، اور ایرانی فارسی ایرانی لب و لہجہ میں اچھی بولتے ہیں، اور ماشاء اللہ مردانہ حسنِ صورت اور اعتدالِ قامت سے بھی سرفراز ہیں، فارسی میں اب جا کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لندن سے حاصل کی ہے، اور ایرانی جہازرانی پر انگریزی میں ایک کتاب بھی لکھی ہے،

غلام رسول خاں آج سے چوبیس برس پہلے امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ میں کابل میں بصیغۂ تعلیمات چند سال رہ چکے تھے، اس لئے ان کی رفاقت سے سب کو بہت آرام پہنچا،

بہرحال اسوقت جب ان صاحبوں سے ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کی کہ مجھے چھوڑ کر آپ سب کے اس تعجیل سفر پر مجھے اردو کا ایک پرانا شعر راستہ بھر یاد آیا کیا،

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

سب نے کہا یہ شعر گویا آج ہی کے لیے کہا گیا تھا،

اس وقت نو بجے شب کو سردار ہاشم خاں صدر اعظم کے ہاں مہمانوں کی دعوت تھی، اُن کا ٹیلیفون آیا کہ "نو وارد مہمان بھی شریکِ دعوت ہوں"، اور لوگ تیار ہو چکے تھے، اس لئے تاخیر کے خیال سے میں بھی اسی حالت میں بلا تبدیل لباس، ساتھ ہوگیا، ہم لوگ دو موٹروں میں روانہ ہوئے، ایک میں ڈاکٹر اقبال، میں اور سرور خاں گویا، اور دوسرے میں سر راس مسعود، پروفیسر ہادی اور غلام رسول خاں، تھوڑی دیر میں صدر اعظم صاحب کے محل تک پہنچے، محل میں ہر جگہ بجلی کی روشنی تھی، جگہ جگہ فوجی سپاہیوں کے پہرے تھے، ایک دروازہ پر پہنچکر اترے، دوسرے مہمان سب پہنچ چکے تھے، سب سے آخر میں ہم لوگ پہنچے تھے، محل میں ہر چیز یورپین طریق و قاعدے تھی، ایک گیلری سے ہو کر اندر وسیع دالان میں پہنچے، سب سے تعارف اور ملاقات ہوئی، مہمانوں میں جن صاحبوں کے نام اسوقت یاد آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں، سردار شاہ محمود خاں وزیر حربیہ، شہزادہ اسد اللہ خاں کمانڈر افواج شاہی، سردار فیض محمد خاں وزیر خارجیہ، سردار احمد خاں وزیر دربار، اللہ نواز خان وزیر فوائد عامہ، میر عطا محمد خاں صدر مجلس

اعیان (پارلیمنٹ) وغیرہ،

چند منٹ کے توقف کے بعد سردار ہاشم خاں صدر اعظم تشریف لائے، بالا قد، وجیہ چہرہ، گورا رنگ، متوسط بدن، فرنچ کٹ داڑھی، سر پر افغانی ٹوپی، جسم پر کوٹ اور پتلون، افغانستان جدید میں امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ سے سر کے علاوہ باقی جسم میں یورپین لباس رواج پذیر ہے، یہاں کے تعلیم یافتہ اصحاب، ارباب مناصب، عہدہ دار، فوج، پولیس، سپاہی، حتیٰ کہ خدام اور سرکاری شوفر تک یہی لباس پہنتے ہیں،

ہاشم خاں نے آکر مہمانوں سے مصافحہ کیا، سردار فیض محمد خاں نے ہندوستانی مہمانوں کا ایک ایک کرکے تعارف کرایا، اس کے بعد سردار ہاشم خاں سب کو لیکر کھانے کے کمرہ میں گئے، کھانا میز و کرسی پر تھا، اور ہر چیز بہ طریق پر آراستہ تھی، کھانا کھلانے والے ملازمین بدستور سیاہ کپڑوں میں تھے، ہاتھوں میں سپید دستانے اور سر پر افغانی ٹوپیاں، کھانے کی گول میز مختلف قسم کے انگوروں اور پھلوں اور گلدانوں سے آراستہ تھی، کھانا کھانے اور کھلانے کا طریق اور ملازموں کا ادب و سلیقہ ہر چیز آجکل کی متمدن دنیا کی سطح کے برابر تھی، اور بقول ڈاکٹر اقبال، ہم کو تعجب ہو رہا تھا کہ آیا ہم افغانستان کے شہر کابل میں ہیں، یا تمدن جدید کی نئی دلی میں،

میز پر مختلف قسم کی باتیں شروع ہوئیں، سرور خاں گویا نے میری طرف اشارہ کرکے کہا کہ مولانا کہتے ہیں کہ رسالہ کابل میں افغانستان کے اکثر علماء و فضلا و شعراء اور ارباب کمال کے حالات چھپتے ہیں، مگر اس کا ذکر اب تک نہیں آیا، جس نے کابل میں سب سے پہلے اسلام کی دعوت پیش کی، سب نے پوچھا وہ کون ہے؟ میں نے کہا خراسان کے عالم مقاتل بن حیان، جو ابو مسلم خراسانی سے بھاگ کر ادھر چلے آئے تھے، اس سلسلۂ سخن سے افغانستان کی تاریخ پر گفتگو شروع ہوگئی، اور اس موضوع پر سردار فیض محمد خاں نے جو عہد امانی میں وزیر تعلیم، اور اب وزیر خارجہ ہیں اس قدر پر معلومات گفتگو فرمائی، اور ہندوستان کے موریا خاندان (پاٹلی پتر) اور پنجاب کی قدیم سلطنتوں اور افغانستان کے تعلقات کا ذکر اس خوبی سے کیا کہ میں ان کا بیحد معترف ہوگیا، سر راس مسعود نے اپنے جاپانی سفر کے حالات سے اس علمی دسترخوان میں نئی لذت پیدا کی، ڈاکٹر اقبال نے فلسفہ و سیاست کے نکات بیان فرمائے،

اسی میز پر رئیس اعیان میر عطا محمد خاں کے متعلق معلوم ہوا کہ ۱۹۲۶ء والی مکہ کی مشہور موتمر اسلامی میں وہ بھی سفیر افغانستان کے ساتھ شریک تھے، اور وہ کہتے تھے کہ میں نے تمہیں وہاں دیکھا تھا، مگر مجھے ملنا یاد نہیں آیا، یہ نہایت متین و سنجیدہ اور خاموش بزرگ ہیں، چہرہ پر خوبصورت داڑھی ہے، سن پچپن اور ساٹھ کے قریب ہوگا، عربی ممالک کی سیاحت کی ہے، اور عربی زبان خوبی اور روانی کے ساتھ بولتے ہیں،

وزیر حربیہ شاہ محمود خاں، نادر خاں شہید مرحوم کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں، ابھی گو جوان ہیں، مگر نہایت مستعد جوان صالح ہیں، ان میں سرداری اور محبوبیت کی شان معلوم ہوتی ہے، وہ اپنی فوجی وردی میں تھے، اور شہزادہ اسد اللہ خاں بھی فوجی وردی میں تھے، یہ شاہی فوجی دستہ کے کمانڈر ہیں، امیر حبیب اللہ خاں مرحوم کے خلف الرشید امیر امان اللہ خاں کے سوتیلے بھائی، اور نادر خاں اور ہاشم خاں وغیرہ کے بھانجے ہیں، ابھی گو سن کم ہے، مگر سعادت کا نور پیشانی پر نمایاں ہے، غالباً پچیس برس کے قریب عمر ہوگی،

ہمارے رفقائے طعام میں اللہ نواز خاں بھی خاص ذکر کے قابل ہیں، شاید لوگوں کو یاد ہو کہ جنگ عظیم کے زمانہ میں اسلامیہ کالج لاہور کے گیارہ طالب علم سرحد پار چلے گئے تھے، اُن میں سے ایک یہ تھے، گو یہ اصلاً افغان ہیں، مگر مدت سے ان کا خاندان ملتان میں آباد ہے، اور وہ اس طرح ہندوستانی اور افغانی دونوں ہیں، بچہ سقا کے ہنگامہ کے وقت جنرل نادر خاں کو جس نے سب سے پہلی مدد دی وہ یہی تھے، اون کا مجاہد کی حیثیت سے سرحد کے بعض قبائل پر اثر تھا، وہ انھیں میں سے تین سو آدمی لیکر نادر خاں کے پاس گئے اور انھیں کا سب سے پہلا دستہ تھا جو شاہ ولی خاں کے ساتھ کابل پہنچا تھا، موجودہ حکومت اون کے خدمات کی پوری قدر کرتی ہے، اور اس نے ذمہ داری کے مختلف عہدوں پر ان کو سرفراز کیا، اور اب وہ آجکل وزیر فوائد عامہ (پبلک ورکس) ہیں، دوہرا بدن، چوڑا چہرہ، گندم گوں رنگ، چہرہ سے استقلال اور عزم برستا ہے،

کھانے سے فارغ ہوکر ملاقات کے پہلے کمرے میں آکر بیٹھے، چائے کافی، سگرٹ وغیرہ سے تواضع ہوتی رہی، سردار ہاشم خاں نے دریافت کیا کہ گانا سننے میں تو کوئی حرج نہیں ہے، میں نے کہا بلا ساز کے کوئی مضائقہ نہیں وہ

وہ شاید ساز کا لفظ نہ سمجھے، فرمایا، ہمارے ہاں رنڈی منڈی نہیں ہوتی، مرد گاتے ہیں، ڈاکٹر اقبال نے تائید کی، گویوں یا قوالوں یا فوجی نغمہ نوازوں کا ایک دستہ آیا، نشستیں کرسیوں پر تھیں، وہ ادب سے آداب بجالاکر نیچے قالین پر بیٹھ گیا، اور نغمہ طرازی شروع کی، ہندوستان میں تو بیدل عظیم آبادی کی بہت کم پرسش ہے، مگر افغانستان اور سنا ہے ایشیائے وسطی کے دوسرے فارسی داں ملکوں میں بیدل کی بہت قدر ہے، قوالوں نے بھی بیدل کی غزل شروع کی، پھر حافظ کی ایک دو غزلیں پڑھیں، پھر بیدل کو شروع کیا، تھوڑی دیر تک یہ مجلس سماع گرم رہی، اس کے بعد از ین میزباں کا شکریہ ادا کرکے سب مہمان ۱۱ بجے رات کے قریب رخصت ہوے،

دوسرے دن جمعہ کا روز تھا، خیال تھا کہ آزاد اسلامی ملک کا بھی جمعہ دیکھیں، صبح کو مختلف اصحاب ملنے کو آئے جنمیں ہندوستانی بھی تھے، اور تعلیم یافتہ افغان، اور اہل منصب بھی، ہندوستان اور افغانستان کے وقت میں قریب قریب ایک گھنٹہ کا فرق ہوتا ہے، وہاں کی گھڑی ہمارے ہاں سے ایک گھنٹہ پیچھے رہتی ہے، میں نے اپنی گھڑی نہیں بدلی تھی، اور صاحبوں نے پیچھے کرلی تھی، نماز کا وقت بارہ بجے کے بعد آگیا، شاہ نادر خاں مرحوم مختلف مسجدوں میں نماز جمعہ ادا کرتے تھے، مگر اس دن شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد میں، جسکا نام "جامع مسجد پل خشتی" ہے، نماز پڑھنے والے تھے، ہم لوگ بھی وہیں پہنچے، امیر معاویہ پر جب سے دمشق کی مسجد میں ایک خارجی نے حملہ کیا تھا، اسوقت سے سلاطین اسلام میں یہ رسم چلی آتی ہے کہ مسجد کی عمارت میں ایک گھرا ہوا کمرہ بادشاہ کے لیے ہوتا ہے، امیر معاویہ نے جب یہ بدعت جاری کی تھی تو اس کا نام مقصورہ تھا، معلوم نہیں افغانستان میں اس کو کیا کہتے ہیں، بہرحال اس جامع مسجد میں بھی یہ مقصورہ بنا ہوا ہے، اور افغانستان کے بادشاہ اسی میں نماز پڑھتے رہے ہیں،

"پل خشتی" ایک پل کا نام ہے، جو لکڑی کے بجائے اینٹوں سے بنا ہے، اسلئے پل خشتی کہلاتا ہے، اور اسی نسبت سے مسجد کو جامع مسجد پل خشتی کہتے ہیں، یہ مسجد پرانے شہر میں ایک تنگ بازار کے اندر واقع ہے، مسجد گو وسیع تھی مگر ہندوستان کی جامع مسجدوں کی طرح شاندار نہیں، نمازی دروازے سے لیکر محراب تک بھرے تھے، غریب مسلمانوں کی کمی نہ تھی، ظاہری حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ ملک کی عام مالی حالت بلند نہیں، یہ سب پرانے افغانی

لباسوں میں تھے، سامنے منبر پر کوئی افغانی مولوی صاحب فارسی میں وعظ فرما رہے تھے،

ہم لوگوں کو شاہی مقصورہ میں لے جایا گیا، وہاں دوسرے مخصوص اصحاب بھی پہلے سے موجود تھے، تھوڑی دیر کے بعد اعلیحضرت شاہ نادر خاں مرحوم تشریف لائے، چھریرا بدن، بالاقامت، جسم پر سیاہی مائل مخطط سوٹ، پاؤں میں بوٹ، سر پر کلاہ اور دستار، ہاتھوں میں سپید دستانے، مسجد میں وہ نہایت سادگی کے ساتھ داخل ہوئے اہل مسجد سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہے، یعنی جن صفوں سے وہ گذرے، وہاں لوگ ان کی تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہوے اور نہ واعظ صاحب نے اپنا وعظ بند کیا، موحد مسلمانوں کی یہ ادا کس قدر مؤثر ہے کہ خانۂ خدا میں غیر خدا کی تعظیم نہیں، جب وہ مقصورہ کے دروازہ کے پاس آئے، تو انھوں نے ایک ایسا منظر دیکھا، جو اسلام کی مساوات کی عملی مثال کے طور پر دل میں محفوظ رہے گا،

وہ مقصورہ کے دروازہ کے سامنے پہنچے تو ایک بلند بالا غریب پیر کہن سال اپنی جگہ سے اٹھکر ان تک پہنچا، سر پر عربی مندیل بندھی تھی، پاس پہنچکر اس نے شاہ مرحوم کے رخسار کو بوسہ دیا، (افغانستان میں محبت کے اظہار کے طور پر ایک دوسرے کے رخسار کو بوسہ دیتے ہیں) شاہ مرحوم نے بھی اسی محبت سے اوسکے رخسار کو بوسہ دیا، اور اوسکو اپنے ساتھ مقصورہ میں لے آئے، اور باڈی گارڈ کے آدمیوں سے فرمایا کہ انکو بھی یہیں اگلی صف میں جگہ دو، اندر آکر سب سے ملے، مجھ سے چونکہ یہ پہلی ملاقات تھی، اسلئے سردار فیض محمد خاں نے مجھے ملایا، مصافحہ کیا، اور تواضع اور خاکساری کے انداز میں خیریت دریافت فرمائی، اور اپنے پہلو میں جگہ دی، تھوڑی دیر کے بعد وعظ ختم ہوا، موذن نے اذان دی، اذان کے بعد سب سنتیں پڑھنے کو کھڑے ہوگئے، پھر دوسری اذان ہوئی، اور خطیب نے عربی زبان میں خطبہ شروع کیا، دوسرے خطبہ کے آخر میں جب خطیب نے شاہ غازی و مجاہد شاہ نادر خاں کا نام لیا، تو میں نے دیکھا کہ مرحوم نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھکر تواضعاً اپنے سر کو جھکا دیا، ان کی یہ ادا مجھے بہت پیاری معلوم ہوئی،

خطبہ کے بعد دوگانۂ جمعہ، اور اس کے بعد حسب معمول سنتیں ادا ہوئیں، لوگ اپنی جگہ جگہ پر بیٹھے رہے،

اس کے بعد امام نے دعا مانگی، اور سب مصلیوں نے بھی آمین کے لئے ہاتھ اٹھائے، نماز سے فارغ ہو کر شاہ مرحوم نے ایک اور موثر نظارہ پیش کیا، ان مرد ضعیف کو اپنے پاس بلا کر ہم لوگوں سے فرمایا کہ "یہ سید ہیں، اور نیک ہیں اور میرے پرانے ملنے والے ہیں" پھر ان سے کہا کہ آپ دعا کیجئے "کہ اسلام کا بھلا ہو، اور مسلمانوں کی خدمت جس سے بن آئے، اسکو نیک توفیق عطا ہو" پہلے تو وہ سمجھے نہیں کہ شاہ مرحوم نے کیا فرمایا، شاہ نے دوبارہ وہی الفاظ فرمائے تو انھوں نے دعا، کے لیے ہاتھ اٹھائے، شاہ مرحوم نے اور ان کے ساتھ ہم لوگوں نے بھی ہاتھ اٹھا کر آمین کہی،

اس کے بعد سب اٹھے، شاہ مرحوم نے ہم مہمانوں سے فرمایا کہ "میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے، اگر آپ لوگ پسند فرمائیں تو ساتھ ہی کھانا تناول کریں" مگر دوسرے ضروری کاموں کے سبب سے ہم سب نے اس وقت معذرت چاہی، اس کے بعد سب ہی ل کر وہ اپنے موٹر پر واپس گئے، ان کے پیچھے اُن کے باڈی گارڈ کی کار روانہ ہوئی ہم غلام ملک کے رہنے والوں کے لیے شاہ و گدا کی یکساں نماز کا نظارہ نہایت موثر تھا، ڈاکٹر اقبال فرمانے لگے کہ آج میں سمجھا کہ دار الحرب میں جمعہ کی نماز کیوں نہیں؟ میں نے عرض کی، ڈاکٹر صاحب آپ نے اسلام کے نظریہ کے طور پر جو فرمایا تھا،

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

آج آپ نے عملاً اسکی تصویر دیکھی، اگر غزنین کا بڑا مرقع نہیں دیکھا تو کابل کا چھوٹا مرقع تو دیکھ لیا، فرمایا ہاں دیکھ لیا،

(باقی)

خیام

از سید سلیمان ندوی

خیام کے سوانح تصنیفات، فلسفہ پر تبصرہ، اور فارسی رباعی کی تاریخ، اور رباعیات خیام پر مفصل مباحث اور آخر میں خیام کے چھ عربی و فارسی رسالوں کا ضمیمہ اور اس کے قلمی رباعیات کے ایک نسخہ کی نقل نثر میں ہے، خیام کے مباحث پر سب سے مفصل، مکمل اور محققانہ و بے مثل کتاب ہے، ضخامت ۵۰۰ صفحات، کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ، قیمت غیر مجلد ہے، مجلد للعہ

"منیجر"

رہبانیت اور اسلام

ورھبانیۃ ن ابتدعوھا ما کتبنٰھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ

از

مولانا عبد السلام ندوی،

اسلام سے پہلے دو متضاد نظام اخلاق دنیا میں قائم تھے، اور ان دونوں کو ان لوگوں نے قائم کیا تھا، جو اپنے دینی اور دنیوی اقتدار سے دنیا کو ان کا پابند بنا سکتے تھے، ایک نظام اخلاق تو روم اور ایران کے شہنشاہوں رئیسوں، امیروں اور دولت مندوں کا تھا، جو ہر قسم کی دنیوی شان و شوکت، دنیوی جاہ و جلال، اور دنیوی آرائش و نمائش کے اظہار کا ذریعہ تھا، اور آج یہی نظام اخلاق یورپ اور امریکہ کے اعلیٰ طبقہ میں پہنچکر اور بھی زیادہ شاندار لطیف اور رنگین ہو گیا ہے، اور تمام دنیا اوسکی پابند ہو رہی ہے،

دوسرا نظام اخلاق یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے مذہبی پیشواؤں کا تھا، جسمیں انتہا درجہ کی بوسیدگی، انتہا درجہ کی شکستگی، انتہا درجہ کی خشکی، اور انتہا درجہ کی ترشروئی پائی جاتی تھی، اور اس میں تکلف کے بجائے سراسر تکلیف ہی تکلیف تھی، لیکن اس تکلیف کے باوجود ان لوگوں کا دینی اقتدار اس کو دنیا میں اس قدر مقبول بنا رہا تھا، کہ جو لوگ اپنے مزاج و طبیعت کے لحاظ سے اس طریق زندگی کے مخالف تھے، وہ بھی ان لوگوں کا احترام کرتے تھے، اور آج بھی جوگیوں سنیاسیوں اور درویشوں کے سامنے بڑے سے بڑے گردن فراز لوگوں کے سر نیاز جھک جاتے ہیں،

اسلام آیا تو یہ دونوں نظام اخلاق انتہائی عروج کی حالت میں قائم تھے، اور اون میں ہر قسم کی

دینی اور دنیوی کشش پائی جاتی تھی، لیکن اسلام نے شدت کے ساتھ ان دونون کی مخالفت کی اور اس کے مقابل مین ایک نہایت معتدل نظام اخلاق قائم کیا جس مین فطری میلان کے سوا کسی قسم کی رنگینی بوقلمونی اور تراش وخراش نہ تھی، باپ ماں کے فرمانبردار رہو، بچون سے محبت رکھو، عورتون کے ساتھ عمدہ سلوک کرو، زمین پر اکڑ کر مت چلو، نرم لہجے مین بولو، اگر کوئی سلام کرے، تو اس کے سلام کا جواب اوس سے بہتر طریقہ پر دو، یہ اور اسی قسم کی سیکڑون اخلاقی باتین اسلامی نظام اخلاق کا جزو ہین، اور یہ ایسی باتین ہین جو بچون کو ریڈرون مین پڑھائی جاتی ہین، اس لئے اس قسم کی سادہ اخلاقی باتون کو سنکر بجا طور پر یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ آخر دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے آخری پیغمبر کا یہ کونسا عظیم الشان اخلاقی کارنامہ ہے اور اس مین کونسی جدت اور ندرت پائی جاتی ہے؟

۱۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ دنیا کی حقیقی چیزین جن سے دنیا اور اہل دنیا کا وجود قائم ہے وہی ہین جو سادہ اور معتدل و فطری ہین، لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ غیر فطری چیزون کی مصنوعی لیکن ضررسان لذتین، دنیا کو ان فطری چیزون سے غافل کر دیتی ہین، اور ایسی حالت مین ایک پیغمبر کا اصلی کارنامہ صرف یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے چہرے سے ان غیر فطری اور مصنوعی چیزون کا نقاب اوتار کر پھینک دے، تا کہ فطرت کا اصلی چہرہ روشن ہو جائے، دودھ اور پانی نہایت سادہ فطری چیزین ہین، مگر انھی دونون سے انسانی زندگی کو نشو ونما حاصل ہوتی ہے، لیکن ایک شرابی، شراب کو ان دونون پر ترجیح دیتا ہے، اور شراب کی مصنوعی لطافتون کے سامنے ان دونون قدرتی چیزون کی کوئی قدر وقیمت نہین ٹھہرتا، ایسی حالت مین اگر کوئی شخص اوس کو دودھ اور پانی کے فوائد اور شراب کے نقصانات سمجھاتا ہے، تو اس کے یہ معنی نہین ہین کہ وہ سائنس کے کسی جدید اور دقیق مسئلہ کی ایجاد کرتا ہے، بلکہ اوس کا اصلی کارنامہ صرف یہ ہوتا ہے، کہ وہ اس شخص کی آنکھون کے سامنے سے نشہ کا مصنوعی پردہ ہٹا دینا چاہتا ہے، رسول اللہ صلعم کے زمانے مین اخلاقی حیثیت سے دنیا کی حالت بھی شرابیون کی سی ہو رہی تھی، ایک طرف تو فرمانروایان روم وایران اپنے شاہانہ ساز وسامان کے نشے مین چور اور دوسری طرف یہودیون عیسائیون اور ہندوؤن کے مذہبی پیشوا اپنی اپنی گدڑی مین مگن تھے،

کہ اسی حالت مین رسول اللہ صلعم نے اپنی سادہ اور معتدل اخلاقی تعلیم سے ان دونون فریق کی آنکھون کے سامنے سے غفلت کے یہ پردے دور کر دئے اور فطرت کا جو خوبصورت چہرہ حریر کی چمکدار قباؤن اور کمل کی گدڑیون کے اندر چھپ گیا تھا، اوس کو اپنے اصلی حسن وجمال مین دنیا کے سامنے پیش کر دیا،

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے جو معتدل فطری نظام اخلاق قائم کیا وہ اگرچہ بظاہر نہایت بے رنگ اور سادہ معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر اس زمانے کی حالت کو پیش نظر رکھا جائے جس مین رسول اللہ صلعم مبعوث ہوئے تھے، تو صاف معلوم ہوگا کہ آپ کی اخلاقی تعلیمات اوس زمانے کے حالات کے بالکل مخالف تھین، اور مخالف حالات پر قابو پانا اور زمانے کی روش کے مخالف چلنا بڑے بڑے اولوالعزم ہی لوگون کا کام ہو سکتا ہے، اوس زمانے مین اہل عرب بالخصوص صحابۂ کرام نہایت غربت و افلاس کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، ایک صحابی کا بیان ہے کہ مین ساتوان مسلمان ہون، اوس وقت یہ حالت تھی کہ ہم لوگ درخت کے پتے کھا کھا کر گذر اوقات کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے جبڑے پھٹ پھٹ گئے تھے،

تمام اہل مدینہ کی عام غذا کھجور اور جو تھی، جو کا آٹا بھی چھنا ہوا نہین ہوتا تھا، کیونکہ صحابہ کے گھرون مین چھلنی نہین ہوتی تھی، آٹا پیس کر مونہ سے پھونک دیتے تھے، بھوسی اُڑ جاتی تھی، اور جو کچھ بچ جاتا تھا اس کو کھا لیتے تھے،

کپڑے کی یہ حالت تھی کہ بہت سے صحابہ کے پاس صرف ایک چادر ہوتی تھی، جس کو گلے مین باندھکر ٹخنون تک لٹکا لیتے تھے، کہ تہ بند اور کرتہ دونون کا کام دے، ایک صحابی نے رسول اللہ صلعم سے دریافت کیا کہ ایک کپڑے مین نماز جائز ہے یا نہین؟ تو ارشاد ہوا،

اولکلکم ثوبان. کیا تم مین ہر شخص کے پاس دو کپڑے ہین،

شادی بیاہ مین دلھنون کو معمولی جوڑا بھی میسر نہین ہوتا تھا، حضرت عائشہ رض کا بیان ہے کہ میرے پاس گاڑھے کی ایک کرتی تھی، شادی بیاہ مین جب کوئی دلھن سنواری جاتی تھی تو وہ مجھ

سے اوس کو مستعار منگوالیتی تھی، رومال نہایت معمولی درجہ کی چیز ہے، لیکن صحابۂ کرام کو وہ بھی میسر نہ تھا، کھانا کھاتے تھے، تو پانوؤن کے تلوون مین ہاتھ پونچھ لیتے تھے،

صحابۂ کرام کے گھر نہایت مختصر، پست اور کم حیثیت ہوتے تھے، اون مین پاخانے تک نہین ہوتے تھے، اور راتون کو گھرون مین چراغ تک نہین جلائے جاتے تھے، یہ حالت بالکل راہبانہ اور جوگیانہ زندگی کے مطابق تھی، اور ایسی حالت مین اگر آپ راہبانہ اور جوگیانہ زندگی کی تعلیم دیتے تو اس ماحول کے بالکل مطابق ہوتی اور صحابۂ کرام نہایت آسانی کے ساتھ اوس کو قبول کر لیتے،

زمانۂ جاہلیت مین بھی مذہبی حیثیت سے اہلِ عرب کا میلان رہبانیت ہی کی طرف تھا، مثلاً مذہبی اعمال مین اہلِ عرب کا سب سے محبوب ترین عمل حج تھا، اور اوس کو وہ طرح طرح کی ریاضتون کے ساتھ ادا کرتے تھے، مثلاً اہلِ یمن جب سفرِ حج کیلئے روانہ ہوتے تھے تو کسی قسم کا زادِ راہ ساتھ نہین لیتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم لوگ متوکل باللہ ہین، خدا کے گھر کا حج کرتے ہین تو کیا وہ ہم کو کھانا نہ کھلائے گا؟ لیکن مدینہ تک پہنچکر بھیک مانگنے لگتے تھے، ایک رسم یہ تھی کہ جب یہ حج کرتے تھے تو گھرون کے اندر دروازے کے راستے سے نہین داخل ہوتے تھے، بلکہ گھر کی پشت سے پھاند کر آتے تھے، کیونکہ وہ چاہتے تھے، کہ زمانۂ حج مین اون کے اور آسمان کے درمیان کوئی درمیانی چیز حائل نہ ہونے پائے، اس لئے اگر وہ دروازون سے گھر مین آتے تو اون کے اور آسمان کے درمیان چھت حائل ہو جاتی، ایک طریقہ یہ تھا کہ ایامِ حج مین قریش کے سوا عرب کے اور تمام مرد اور عورت ننگے ہو کر طواف کرتے تھے، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی، کہ قریش کے لوگ چونکہ خانۂ کعبہ کے مجاور تھے، اس لئے اونھون نے تمام اہلِ عرب پر اپنا تفوق قائم کرنے کیلئے یہ طریقہ ایجاد کر لیا تھا، دوسری بات یہ تھی کہ اہلِ عرب کپڑے پہن کر مذہبی مراسم کا ادا کرنا مذہبی زہد و تقشف کے مخالف سمجھتے تھے، زمانۂ جاہلیت کی ان سختیون کا اثر عہدِ اسلام مین بھی قائم رہا، چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلعم نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا

کہ اپنے دونون بیٹون کا سہارا دیکر چل رہا ہے، وجہ دریافت فرمائی تو معلوم ہوا کہ اوس نے خانۂ کعبہ تک پاپیادہ چلنے کی منت مانی ہے، ایک صحابیہ نے بھی اسی قسم کا ارادہ کیا اور رسول اللہ ص سے اس کے متعلق دریافت کیا، تو آپ نے فرمایا پیدل بھی چلو اور سوار بھی ہو لیا کرو، ایک طریقہ یہ تھا کہ اونٹون کی طرح ناک مین نکیل ڈال لیتے تھے، دوسرا شخص اسکو پکڑ کر کھینچتا تھا، خود رسول اللہ صلعم نے اسی طرح ایک شخص کو طواف کرتے دیکھا،

حج کا زمانہ عرب مین خصوصیت کے ساتھ تجارتی گرم بازاری کا زمانہ تھا، لیکن اسلام لانے کے بعد صحابۂ کرام زمانۂ حج مین تجارت کو ایک گناہ کا کام سمجھتے تھے، اور کہتے تھے کہ یہ تو صرف ذکر و عبادت کا زمانہ ہے، ان کے علاوہ اس زمانہ مین اور کسی دنیوی کام مین مشغول نہین ہونا چاہیے،

بعض لوگ روزے کے متعلق بھی طرح طرح کی سختیون کا التزام کرتے تھے، مثلاً روزہ رکھتے تھے تو دھوپ مین کھڑے رہتے تھے، اور کسی سے بات چیت نہین کرتے تھے، اور ان تمام حالات نے رہبانیت کی تعلیم کیلئے فضا کو بالکل صاف کر دیا تھا، اسلام آیا تو اوس نے صحابۂ کرام مین اور بھی شدت کے ساتھ ذوقِ عمل پیدا کیا، اور اس حالت مین قدرتی طور پر بہت سے صحابہ رہبانیت کی طرف مائل ہوئے، چنانچہ چند صحابہ نے رسول اللہ صلعم کی بیبیون کی خدمت مین آکر آپ کی عبادت کا حال دریافت کیا، لیکن جب آپ کی معتدل عبادت گذاری کا حال معلوم ہوا، تو اونھون نے اپنے معیار کے مطابق اوس کو کم سمجھا، اور اوس کی یہ تاویل کی کہ ہم مین اور رسول اللہ صلعم مین بہت بڑا فرق ہے، کیونکہ آپ کے اگلے پچھلے گناہ سب معاف ہو چکے ہین، اسلئے آپ کو بہت زیادہ عبادت کی ضرورت نہین، اسلئے ان مین ایک صاحب نے کہا کہ مین رات بھر نماز پڑھتا رہونگا، ایک بزرگ نے فرمایا کہ مین ہمیشہ روزہ رکھونگا، ایک صحابی بولے کہ مین کبھی نکاح ہی نہ کرونگا، حضرت عثمان بن مظعون ؓ ایک رہبانیت پسند صحابی تھے، اونھون نے اپنے اوپر عورت، خوشبو، اور ہر لذیذ چیز کو حرام کرنا چاہا، یہانتک کہ رسول اللہ صلعم سے بدھی ہونے کی اجازت حاصل کرنی چاہی، اور صحابہ کہتے ہین، کہ اگر آپ اون کی یہ درخواست منظور فرما لیتے تو ہم سب کے سب بدھی ہو جاتے،

ان کے علاوہ ، اور بھی بہت سے صحابہ تھے ، جو سخت سے سخت ریاضت اور سخت سے سخت عبادت میں معروف رہتے تھے ، چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلعم نے دیکھا کہ مسجد کے دونون ستونون کے درمیان ایک رسی بندھی ہوئی ہے ، دریافت فرمایا کہ یہ رسی کیسی ہے ؟ معلوم ہوا کہ ایک صحابیہ نے جن کا نام زینب ہے یہ رسی باندھ رکھی ہے ، جب نماز پڑھتے پڑھتے تھک جاتی ہین تو اوس سے لٹک جاتی ہین ، تاکہ نیند نہ آنے پائے ایک صحابی تھے جو ہمیشہ دن کو روزہ رکھتے تھے ، اور رات کو نماز پڑھتے تھے ،

اسلام مین جہاد بھی ایک عبادت ہے ، اس لئے اس کا شوق بھی صحابہ کے دلون مین رہبانیت کا میلان پیدا کرتا تھا ، چنانچہ حضرت سعد بن ہشام رض فرماتے ہین کہ مین نے اپنی بی بی کو طلاق دیدی ، اور مدینہ آیا کہ وہان کی جائداد کو بیچ کر ہتھیار خریدون اور جہاد کرون ، اون کو چند صحابہ اور ملے جنھون نے کہا کہ ہم مین سے اور چھ شخصون نے بھی یہی ارادہ کیا تھا ،

ان سب سے بڑھکر یہ کہ خود صحابہ مین اصحاب صفہ کا ایک گروہ ایسا موجود تھا ، جو بالکل راہبانہ زندگی بسر کرتا تھا ، یہ وہ لوگ تھے جنھون نے اپنے آپ کو بالکل خدمت اسلام کیلئے وقف کر دیا تھا ، اور ہر قسم کے دنیوی کاروبار یعنی زراعت تجارت اور ملازمت وغیرہ کو چھوڑ کر اپنی زندگی صرف عبادت گذاری کیلئے نذر کر دی تھی ، یہ لوگ راتون کو عموماً عبادت کرتے تھے ، اور قرآن مجید پڑھا کرتے تھے ، ان مین ایک ٹولی دن کو جنگل سے لکڑیان چُن لاتی تھی ، اور اس کو بیچ کر اپنے بھائیون کیلئے کھانا مہیا کرتی تھی ، ان لوگون کے بال بچے نہ تھے ، اور جب شادی کر لیتے تھے ، تو اوس حلقہ سے نکل جاتے تھے ، ان مین سے کسی کے پاس چادر اور تہمد دونون چیزین ایک ساتھ کبھی مہیا نہ ہو سکین ، چادر کو گلے سے اس طرح باندھ لیتے ، کہ رانون تک لٹک آتی تھی ، اکثر انصار کھجور کی پھلی ہوئی شاخین توڑ کر لاتے ، اور مسجد کی چھت مین لگا دیتے تھے ، کھجورین جو ٹپک ٹپک کر گرتی تھین ، یہ لوگ اون کو اوٹھا کر کھا لیتے تھے ، کبھی دو دو دن کھانے کو نہین ملتا تھا ، رسول اللہ صلعم کے پاس جب کہین سے کوئی صدقہ کا کھانا آتا تھا ، تو مسلم اون کے پاس بھیج دیتے تھے

اور جب دعوت کا کھانا آتا تھا ، تو اون کو بلا لیتے تھے ، اور ان کے ساتھ بیٹھکر کھاتے تھے ، اکثر ایسا ہوتا تھا کہ راتون کو رسول اللہ صلعم ان کو مہاجرین اور انصار پر تقسیم کر دیتے تھے یعنی اپنے مقدور کے موافق ہر شخص ایک ایک دو دو آدمی کو اپنے ساتھ لیجاتا تھا ، اور ان کو کھانا کھلاتا تھا ، چنانچہ بعض فیاض اور دولت مند صحابہ کبھی کبھی اسی اسی آدمیون کو ساتھ لیجا کر کھانا کھلاتے تھے ، ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی ، کل مجموعی تعداد ۴۰۰ تک پہنچی تھی ،

ان تمام واقعات کے پیش نظر رکھنے کے بعد علانیہ ثابت ہوتا ہے ، کہ اسلام کی ابتدائی تاریخ بالکل رہبانی تعلیم کی دعوت دے رہی تھی ، لیکن بااینہمہ رسول اللہ صلعم نے رہبانیت کی مخالفت کی ، اور عام اعلان فرمایا ،

انّ اللہ ابدلنا بالرّھبانیۃ الحنفیۃ

خدا نے رہبانیت کے بدے ہم کو آسان اور سیدھا مذہب عطا فرمایا ،

اور جو لوگ نکاح کو مذہبی زہد و تقشف کے خلاف سمجھتے تھے ، اون کو ہدایت فرمائی ،

تزوجوا فانی مکاثر بکم الامم ولا تکونوا کرھبانیۃ النصاری .

یعنی نکاح کرو کیونکہ مین اور امتون کے مقابل مین تمھاری بڑھی ہوئی نسلی تعداد پر فخر کرونگا ، اور عیسائیون کی طرح جوگی پنا نہ اختیار کرو ،

صرف اسی پر اکتفا نہین کیا بلکہ رہبانیت کے خلاف متعدد دلائل قائم کئے :-

۱- چنانچہ حضرت عثمان بن مظعون رض کے متعلق جب عورت ، خوشبو ، اور تمام لذیذ چیزون کو اپنے اوپر حرام کر لینا چاہتے تھے ، یہ آیت نازل ہوئی :-

یاایھا الذین آمنوا لا تحرموا طیبٰت ما احل اللہ لکم ولا تعتدوا انّ اللہ لا یحب المعتدین .

مسلمانو ! خدا نے جو پاکیزہ چیزین تمھارے لئے حلال کر دی ہین ، اون کو (اپنے اوپر) حرام نہ کرو ، اور حد سے نہ بڑھو ، کیونکہ خدا حد سے بڑھنے والون

اس ایت سے یہ تصریح ثابت ہوا کہ اسلام نے رہبانیت کی مخالفت اس بنا پر کی کہ وہ توسط اور اعتدال کے مخالف تھی، کیونکہ انسانی زندگی کا مقصد صرف عیش و عشرت نہین ہے، لیکن اس معاملہ مین اس قدر حد سے بھی نہ بڑھ جانا چاہئے، کہ ہر خوشگوار اور لذیذ چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیا جائے، یہان تک کہ شراب کی طرح برف کا شربت بھی ناجائز ہو، اور اجنبی عورتون کی طرح اپنی عورت بھی اپنے اوپر حرام کر لیجائے،

۲- دوسری بات یہ ہے کہ رہبانیت کی بنیاد درحقیقت نفس کشی پر قائم تھی، یعنی بہت سے لوگون کا خیال تھا کہ انسان خدا کیلئے جسقدر دکھ اٹھاتا ہے، اوسی قدر خدا اوس سے خوش ہوتا ہے، لیکن رسول اللہ صلعم نے اس خیال کو غلط قرار دیا، چنانچہ ایک صحابی ایک سال آپ کی خدمت مین حاضر ہو کر واپس چلے گئے، دوسرے سال پھر حاضر خدمت ہوئے، تو صورت اس قدر بدل گئی تھی، کہ آپ نے اُن کو نہین پہچانا، اور اونھون نے خود اپنا تعارف کرایا، تو آپ نے فرمایا تمھارا رنگ روپ کیون بدل گیا، تمھاری صورت تو اچھی خاصی تھی، بولے جب سے آپ سے جدا ہوا رات کے سوا اون کو کبھی نہین کھایا، یعنی برابر روزے رکھے، فرمایا تم نے اپنی جان کو کیون دکھ دیا، ؟ پورے رمضان کا روزہ رکھو، اور ہر مہینے مین صرف ایک دن کا۔

۳- رہبانیت کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے، کہ انسان عبادت کی معمولی مقدار پر قناعت نہین کرتا، بلکہ اس قدر عبادت کرتا ہے، جو انسانی طاقت سے باہر ہوتی ہے، چنانچہ جن صحابیہ نے مسجد کے دونون ستونون کے درمیان ایک رسی باندھ رکھی تھی، جب نماز پڑھتے پڑھتے تھک جاتی تھین تو اس سے لٹک جاتی تھین، تاکہ نیند نہ آنے پائے لیکن رسول اللہ صلعم نے اس رسی کو کھلوا دیا، اور فرمایا کہ

لیصل احدکم نشاطہ فاذا فتر فلیقعد۔

یعنی جب تک آدمی چیت و چالاک رہے اوس وقت تک نماز پڑھے اور جب تھک جائے تو بیٹھ جائے،

اس غیر معمولی عبادت کے بے نتیجہ ہونیکی ایک وجہ اور تباہی،

علیکم ما تطیقون من الاعمال فان اللہ لا یمل حتی تملوا۔

یعنی تم لوگ صرف اوتنی ہی عبادت کرو جتنی کہ تمکو طاقت ہے، کیونکہ خدا ثواب دینے سے اوس وقت تک نہین تھکتا، جب تک تم لوگ خود نہ تھک جاؤ۔

ایک حدیث مین ہے، کہ جب کسی کو نماز پڑھتے پڑھتے نیند آنے لگے، تو اُس کو سو رہنا چاہئے، کیونکہ ممکن ہے کہ استغفار کی حالت مین توبہ و استغفار کے بجائے وہ اپنے آپ کو گالیان دینے لگے،

اصل یہ ہے کہ دل پر اثر کسی کام کی کثرت کا نہین ہوتا، بلکہ مداومت کا ہوتا ہے یعنی جو کام ہمیشہ کیا جاتا ہے گو اوسکی مقدار کم ہو، وہی نتیجہ خیز ہوتا ہے، چنانچہ حدیث مین ہے کہ

اِنَّ اَحَبَّ الاعمال ادومھا الی اللہ وان قل۔

یعنی خدا کو وہی عبادت سب سے زیادہ پسند ہے جو ہمیشہ کی جائے، گو وہ کم ہو۔

رسول اللہ صلعم سے زیادہ عبادت گذار کون ہوگا؟ لیکن جب حضرت عائشہ رض سے سوال کیا گیا، کہ رسول اللہ صلعم کو کون سی عبادت سب سے زیادہ پسند تھی، تو بولین کہ وہ جو ہمیشہ کیجائے، اسی اصول کی بنا پر اسلام نے کثرتِ عبادت اور کثرتِ ریاضت کو ناجائز قرار دیا، اور اسی چیز پر رہبانیت کی بنیاد قائم تھی،

۴- رہبانیت کی بنیاد ایک اور چیز پر بھی قائم ہے، یعنی گوشہ نشینی اور مخلوق الٰہی سے علحدگی پر، اس لئے اصلی سوال یہ ہے کہ سوسائٹی سے الگ ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی بہتر ہے، یا سوسائٹی مین شامل ہو کر رہنا افضل ہے، ؟ اسلام نے دوسری صورت کو ترجیح دیا ہے، چنانچہ حدیث مین ہے:-

انّ المسلم اذا کان یخالط النّاس و یصبر علی اذاھم خیر من المسلم الذی لا یخالط الناس و لا یصبر علی اذاھم۔

جو مسلمان لوگون مین مل جل کر رہتا ہے، اور اون کی دی ہوئی تکلیفون پر صبر کرتا ہے، اوس مسلمان سے بہتر ہے جو لوگون مین نہ تو مل جل کر رہتا ہے نہ اُن کی دی ہوئی تکلیفون پر صبر کرتا،

حکمائے اسلام نے فلسفۂ اخلاق پر جو کتابین لکھی ہین، اون مین بھی یہی ثابت کیا ہے کہ انسان

کے فضائل اخلاق کا ظہور صرف سوسائٹی مین رہنے سے ہوتا ہے، سوسائٹی سے الگ رہکر کوئی شخص محاسن اخلاق کا اظہار نہین کرسکتا، چنانچہ ابن مسکویہ کتاب الطہارۃ مین لکھتا ہے کہ

"حکما کا قول ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے یعنی وہ ایک ایسے شہر کا محتاج ہے، جسمین بہت سے لوگ رہتے ہون، تاکہ اوسکی انسانی سعادت مکمل ہوجائے، یہی وجہ ہے کہ انسان لوگون کی دوستی، معاشرت اور اون کی سچی محبت کرنے پر مجبور ہے، کیونکہ یہ لوگ اوسکی ذات اور اس کی انسانیت کو مکمل کرتے ہین، اور وہ بھی اون کے لئے ایسا ہی کرتا ہے، پس جب یہ فطری ضرورت ٹھہری تو ایک عقلمند آدمی کیونکر تنہائی اور گوشہ نشینی کو اختیار کرسکتا ہے، اور ایسی حالت مین جو لوگ سوسائٹی سے الگ ہوکر پہاڑون کے غارون مین رہتے ہین، یا میدانون مین عبادت خانے بنا لیتے ہین، یا شہرون مین پھرا کرتے ہین، اون کو کوئی اخلاقی فضیلت بلکہ سرے سے انسانیت ہی نہین حاصل ہوتی، کیونکہ جو شخص سوسائٹی سے الگ ہتا ہے، اوس سے بہادری، سخاوت اور عدالت کوئی چیز ظاہر نہین ہوسکتی بلکہ اوس کے فطری قوا اور ملکات بالکل بیکار ہوجاتے ہین، اور اون کا رُخ خیر و شر کسی کی طرف نہین ہوتا، ایسی حالت مین یہ لوگ بمنزلہ جمادات اور مردون کے ہین، کہ وہ لوگ اپنی نسبت خود خیال کرتے ہین اور دوسرے لوگون کا بھی اُن کی نسبت یہی خیال ہوتا کہ وہ پاکباز اور عادل ہوتے ہین لیکن درحقیقت وہ پاکباز اور عادل نہین ہوتے، یہی حال تمام اخلاقی فضائل کا ہے یعنی جب اس قسم کے لوگون سے برائیان نہین سرزد ہوتین، تو لوگ یہ خیال کرتے ہین کہ یہ لوگ صاحب اخلاق ہین، حالانکہ اخلاق فضائل ایسی چیز نہین، بلکہ وہ افعال و اعمال ہین، جن کا ظہور تمام معاملات اور تمام اجتماعی کامون مین مشہور آدمیون کے سامنا اون کے گھرون مین ہوتا ہے"

اسی فلسفیانہ اصول کی بنا پر اسلام نے اجتماعی زندگی کو فضائل اخلاق کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا اور راہبانہ زندگی کی تمام خصوصیات کے مخالف اخلاقی تعلیم دی، مثلاً راہبانہ زندگی کا نتیجہ یہ تھا کہ اعزہ واقارب بلکہ مان

باپ تک کی محبت دلون سے جاتی رہتی تھی، زندہ دلی اور خوش طبعی کا نام و نشان تک باقی نہ رہا تھا، لیکن اس کے مخالف اسلام نے اعزہ واقارب بالخصوص مان باپ کے تعلقات کو نہایت اہم اور ضروری قرار دیا، چنانچہ ایک شخص نے رسول اللہ صلعم سے دریافت کیا، کہ میری بہترین خدمت کا مستحق سب سے زیادہ کون ہے؟ فرمایا "تمھاری مان"، اوس نے کہا کہ پھر کون، فرمایا "تمھارا باپ"، عیسائی راہب عورتون سے سخت نفرت رکھتے تھے، لیکن اسلام نے عورتون کو زندگی کا نہایت ضروری جزو ٹھہرایا، اور رسول اللہ صلعم نے فرمایا:-

الدنیا متاع وخیر متاع الدنیا المرأۃ الصالحۃ. — یعنی دنیا ایک پونجی ہے، اور دنیا کی سب سے بہتر پونجی نیک عورت ہے۔

اور خانگی ضروریات اور معاشرتی تعلقات کے علاوہ، عورت کو شگفتگی خاطر، اور خوش طبعی کا ایک ذریعہ قرار دیا، چنانچہ ایک صحابی نے ایک شادی شدہ عورت سے نکاح کیا تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ

فہلا تزوجت بکرا تضاحلک وتضاحکھا وتلاعبک وتلاعبھا. — یعنی تم نے کنواری عورت سے شادی کیون نہین کی جو تم سے ہنسی مذاق کرتی اور تم اوس سے ہنسی مذاق کرتے، وہ تمھارے ساتھ کھیلتی، اور تم اوس

اولاد کی پرورش اور محبت کو بہت بڑی اخلاقی فضیلت قرار دیا، اور جو عورتین اولاد سے زیادہ محبت رکھتی تھین، خاص طور پر اون کی تحسین و ستایش کی، چنانچہ فرمایا:-

خیر نساء رکبن الابل نساء قریش احناھن علی ولد فی صغرہ. — عرب کی عورتون مین سب سے بہتر قریش کی عورتین ہین جو بچپن مین بچون سے بہت زیادہ محبت رکھتی ہین

ایک صحابی آپ کی خدمت مین اپنے بچے کو لیکر حاضر ہوئے، اور اوس کو چمٹانے لگے، آپ نے فرمایا "تم کو اوس سے محبت ہے؟" بولے "ہان" فرمایا اس سے زیادہ تم سے ارحم الراحمین کو محبت ہے، بعض صحابہ ایسے تھے، جو اپنے تمام مال و دولت کو خدا کی راہ مین دے دینا چاہتے تھے، لیکن چونکہ اس سے اولاد کے حق

کو صدمہ پہنچتا تھا، اس لئے رسول اللہ صلعم نے اون کو اس نیت سے باز رکھا، چنانچہ ایک صحابی نے اپنے
مرض الموت مین آپ سے درخواست کی، کہ مین صاحب مال ہون اور میری وارث صرف ایک لڑکی ہے، کیا
مین اپنے مال کا دو ثلث خیرات کر سکتا ہون؟ فرمایا نہین، اونھون نے کہا تو آدھا، فرمایا نہین صرف ایک
تہائی "اور یہ بھی بہت ہی، اگر تم اپنے ورثہ کو دولتمند چھوڑ جاؤ تو یہ اس سے بہتر ہے کہ ان کو محتاج اور بھیک
منگا بنا کر چھوڑ جاؤ، تم خالصۃً لوجہ اللہ جو کچھ بھی صرف کروگے یہان تک کہ اپنی بی بی کے منہ مین اگر لقمہ بھی ڈالوگے،
تو تم کو اس کا ثواب ملے گا"۔

زندہ دلی اور خوش طبعی کی یہ کیفیت تھی کہ خود رسول اللہ صلعم کا معمول تھا، کہ نماز فجر کے بعد طلوع
آفتاب تک مصلے پر بیٹھے رہتے تھے، اور اس حالت مین صحابۂ کرام زمانۂ جاہلیت کے واقعات بیان کرتے
تھے اشعار پڑھتے تھے، اور ہنستے تھے اور آپ ان تذکرون کو سنکر مسکراتے تھے،

عید کے دن چھوٹے چھوٹے لڑکے اور چھوٹی چھوٹی لڑکیان آپ کے پاس جمع ہو کر باجے بجاتی
تھین اور مسرت کے ترانے گاتی تھین، حدیث کی کتابون مین ہے کہ صحابۂ کرام مردہ دل اور خشک مزاج
نہ تھے، بلکہ اپنی صحبتون مین اشعار پڑھتے تھے، اور جاہلیت کے واقعات کا تذکرہ کرتے تھے،

۲- راہبانہ زندگی کا دوسرا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ انسان کھانے پہننے اور رہنے سہنے کے تمام
پر لطف اور راحت رسان طریقون کو چھوڑ کر نہایت ادنی درجہ کی وحشیانہ زندگی بسر کرنے لگتا ہو، چنانچہ
ایک راہب نے پورے ۴۰ سال جو کی روٹی اور گدلے پانی پر بسر کئے، ایک اور راہب سال بھر مین صرف
ایک بار ایسٹر کے دن حجامت بنواتا تھا، نہ کبھی کپڑا بدلتا تھا، نہ اوس کو دھوتا تھا، یہانتک کہ وہ خود ہی ٹکڑے
ٹکڑے ہو کر جسم سے اوتر جاتا تھا، ایک اور راہب عمر بھر ایک تنگ و تار غار مین رہا، ایک اور بزرگ
جنگل کی خاردار جھاڑیون مین رہتے تھے، اور سونے کیلئے کبھی نہین لیٹتے تھے، ایک راہب نے پچاس سال
تک اپنے چہرہ یا پاؤن پر پانی کی چھینٹ تک پڑنے نہین دی، لیکن اسلام چونکہ اصولاً اس زندگی کا

مخالف تھا، اس لئے رسول اللہ صلعم نے ہر موقع پر اس کی مخالفت کی، چنانچہ ایک بار بعض صحابہ نے اسی
قسم کی راہبانہ زندگی بسر کرنے کا تہیہ کیا، اور ان مین ایک صاحب نے کہا کہ "مین بچھونے پر نہ سوؤنگا" رسول
اللہ صلعم کو خبر ہوئی تو ایک عام تقریر کی جسمین فرمایا کہ لوگ ایسا کیون کہتے ہین؟ مین تو نماز بھی پڑھتا ہون
اور سوتا بھی ہون، روزہ بھی رکھتا ہون اور افطار بھی کرتا ہون، اور نکاح بھی کرتا ہون، تو جو شخص میرے
طریقہ سے انحراف کرے گا، وہ مجھ سے الگ ہی"، ایک صحابی کہتے ہین، کہ جب ہم لوگ رسول اللہ صلعم کے
ساتھ رہتے تھے، اور پانی برستا تھا، تو ہمارے جسم سے بھیڑ اور بکری کی بو آتی تھی، یعنی چونکہ صحابہ غربت و افلاس
کی وجہ سے بھیڑ بکری کے اون کا کپڑا پہنتے تھے، اس لئے جب اون پر بارش کے چھینٹے پڑتے تھے، تو ان
سے بھیڑ بکری کی بو آتی تھی، یہ ایک قدرتی رہبانیت تھی جس کو آسانی کے ساتھ قائم رکھا جا سکتا تھا لیکن
اسلام چونکہ اصولاً راہبانہ زندگی کا مخالف تھا، اس لئے اوس نے اس ناگوار حالت مین تغیر پیدا کیا، اور
رسول اللہ صلعم نے ہر جمعہ کو غسل کرنا، اور خوشبو لگانا واجب یا کم از کم سنت قرار دیا، لیکن یہ غسل کیون
ضروری قرار دیا گیا، اس کی وجہ خود صحابہ کی زبان سے سننا چاہئے،

حضرت عبد اللہ بن عباس رض بیان فرماتے ہین، کہ صحابۂ کرام سخت تنگدست تھے، کمل کے کپڑے
پہنتے تھے، اپنی پیٹھ پر بوجھ لادتے تھے، اور اون کی مسجد نہایت تنگ اور اوس کی چھت نہایت پست تھی
یعنی اوپر چھت کی جگہ صرف ایک چھپر تھا، ایک روز رسول اللہ صلعم نماز جمعہ کیلئے مسجد مین آئے دن نہایت
گرم تھا، لوگون کو کمل کے کپڑے مین پسینہ آیا تو اون کے بدن سے اس قدر بو پھیلی کہ سب کو تکلیف ہوئی
رسول اللہ صلعم کو بو کا احساس ہوا تو فرمایا کہ لوگو جب یہ دن آئے تو غسل کر لیا کرو، اور جہان تک ممکن ہو
عمدہ تیل اور عمدہ خوشبو لگاؤ، صرف جمعہ ہی کی تخصیص نہین بلکہ آپ صفائی اور ستھرائی کو عموماً بہت زیادہ پسند کرتے تھے
اور لوگون کو مہذب صورت مین رہنے کی ترغیب دیا کرتے تھے، چنانچہ آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اوس کے
بال بکھرے ہوئے ہین، نہ تو اوس نے تیل لگایا ہے، نہ کنگھی کی ہے، فرمایا کیا اس کو بالون کے

سلجھانے اور ہموار کرنے کا سامان میسر نہین، ایک اور شخص کو دیکھا کہ نہایت گندہ اور میلے کچیلے کپڑے پہنے
ہوے ہو، فرمایا کیا اوس کو پانی نہین ملتا جس سے وہ اپنے کپڑے کو دھولے، ایک اور صحابی کہتے ہین،
کہ مین رسول اللہ صلعم کی خدمت مین نہایت معمولی درجہ کے کپڑے پہنکر حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کیا تمھارے
پاس مال ہے؟ اونھون نے کہا ہان، فرمایا کس قسم کا مال ہے، بولے خدا نے مجھکو اونٹ، بکریان، گھوڑے،
غلام سب کچھ دیا ہے، ارشاد ہوا کہ جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے احسان کے نشانات تمھارے
جسم سے ظاہر ہونے چاہئین، یعنی تم کو اپنی حیثیت کے موافق کپڑے پہننے چاہئین،

جسمانی طہارت و پاکیزگی، بلکہ جسمانی زیب و زینت کی چند معمولی چیزین ایسی ہین، جو تمدن اور وحشیانہ
زندگی کے درمیان حد فاصل ہو سکتی ہین، اور اون کی پابندی مین بہت سا وقت اور بہت سا روپیہ
بھی صرف نہین ہوتا، لیکن راہب اور سنیاسی لوگ چونکہ ہر ممکن طریقہ سے زیب و زینت کی چیزون سے
احتراز کرتے ہین، اس لئے ان کی پابندی کو مذہبی زہد و تقشف کے خلاف سمجھتے ہین، جس کا نتیجہ یہ ہوتا
ہے کہ ان کی شکل و صورت نہایت وحشیانہ ہو جاتی ہے، اور صفائی و پاکیزگی ان کو چھو بھی نہین جاتی لیکن
اسلام چونکہ دنیا کو وحشیانہ حالت سے نکالنے اور تہذیب و شایستگی کے پھیلانے کیلئے آیا تھا، اس لئے
رسول اللہ صلعم نے ان چیزون کو خصال الفطرۃ کا لقب دیا اور فرمایا، کہ "دس باتین فطرت مین محسوب ہین"
یعنی مونچھ ترشوانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک مین پانی ڈالنا، ناخن ترشوانا، انگلیون کی بیچ کی
جگہ کو دھونا، بغل اور زیر ناف کے بال منڈوانا، منہ مین پانی ڈال کر کلی کرنا، اور استنجا کرنا، بعض
احادیث سے معلوم ہوتا ہے، کہ دین فطرت کے بانی اول یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے ان
باتون پر عمل کر کے خدا سے دریافت کیا، کہ یہ کیا ہے، ؟ جواب ملا کہ "وقار" فرمایا تو خداوندا میرے وقار
کو اور بڑھا، ان تعلیمات کو پیش نظر رکھکر اگر وشنو سنیاسیون، سادھوؤن اور راہبون کی جسمانی حالت
پر نظر ڈالی جائے، تو صاف معلوم ہوگا کہ ان لوگون نے دنیا مین رہبانیت اور سنیاس کے نام سے کسقدر

غلاظت نجاست، گندگی، بلکہ وحشت پھیلا رکھی تھی، لیکن اسلام نے رہبانیت کا خاتمہ کر کے انسانیت کے چہرے
کو کس قدر نازک لطیف اور روشن کر دیا، لیکن ان تعلیمات کے ساتھ اسلام نے انتہا درجہ کی نمایش اور
آرایش کی بھی ممانعت کی ہے، چنانچہ حضرت فضالہ بن عبید رضہ مصر کے گورنر تھے، لیکن ان کی یہ حالت تھی، کہ ایک
دوسرے صحابی اون سے ملنے کیلئے گئے، تو دیکھا کہ اون کے بال بکھرے ہوئے ہین، وجہ پوچھی تو بولے کہ رسول
اللہ صلعم ہم لوگون کو بہت زیادہ عیش پرستی سے منع فرماتے تھے، سر سے اوتر کر پاؤن پر نظر پڑی تو دیکھا کہ
پاؤن مین جوتا نہین ہو، بولے آخر ایسا کیون ہے، ؟ فرمایا کہ رسول اللہ صلعم نے ہم کو حکم دیا ہو کہ کبھی کبھی ننگے پاؤن
رہا کرین، اس لئے رسول اللہ صلعم کی اخلاقی تعلیمات کا ایک حصہ ایسا بھی ہے، جو راہبانہ اور جوگیانہ زندگی
سے ملتا جلتا ہو،

چنانچہ ایک بار آپکے سامنے صحابہ کرام نے دنیوی عیش و عشرت کا ذکر کیا تو فرمایا کہ کیا تم لوگ نہین
سنتے ؟ کیا تم لوگ نہین سنتے، ؟ پھٹے حال مین رہنا ایمان کا ایک جزو ہے، ایمان کا ایک جزو ہے، ایک حدیث
مین ہے کہ خدا نے تم کو جو کچھ دیا ہے، اوس پر خوش رہو، تو سب سے زیادہ دولتمند سمجھے جاؤگے اور بہت زیادہ نہ
ہنسو، کیونکہ اس سے دل مردہ ہو جاتا ہو، ایک صحابی سے آپنے فرمایا کہ تم کو مال و دولت مین سے صرف ایک
خادم اور ایک سواری جس پر سوار ہو کر تم جہاد کر سکو، کافی ہے، ایک حدیث مین ہے کہ کھیتی باڑی نہ کرو اس
سے تمھارے دلون مین دنیاداری کا میلان پیدا ہوگا،

ایک حدیث مین ہے کہ اگر تم لوگ خدا پر اچھی طرح توکل کرو تو تم کو روزی اوسی طرح ملے گی،
جس طرح چڑیون کو ملتی ہے، کہ صبح کو خالی پیٹ جاتی ہین اور شام کو پیٹ بھر کے آتی ہین،

ایک حدیث مین ہے، کہ مجھکو سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے، جو گمنام ہو، اور تھوڑی سی روزی رکھتا ہو
اور اسی پر قناعت کرے، ایک صحابی نے آپ سے کہا کہ مین آپ کو محبوب رکھتا ہون، فرمایا ذرا سوچ سمجھ کے
کہو، اونھون نے کہا، خدا کی قسم مین آپ کو محبوب رکھتا ہون، فرمایا اگر تم مجھے محبوب رکھتے ہو، تو فقر و فاقے

کیلئے تیار ہو جاؤ کیونکہ جو شخص مجھکو محبوب رکھتا ہے اسکی طرف احتیاج سیلاب کی طرح بڑھتی ہے،

ایک حدیث میں ہے کہ جنت میں میرے حوض پر پہلے فقرأ مہاجرین اوترین گے، جن کے سرون کے بال پریشان اور کپڑے میلے ہین، جو نازپروردہ عورتون سے نکاح کرنے کی صلاحیت نہین رکھتے، اور جب کسی کے دروازے پر جاتے ہین، تو اون کو اندر آنے کی اجازت نہین ملتی" ایک حدیث مین ہے کہ جو شخص باوجود استطاعت کے محض خاکساری سے عمدہ لباس کا پہننا ترک کر دے گا، خدا اوس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلائے گا اور اوس کو اختیار دے گا، کہ اہل ایمان کے حلون مین سے جو حلہ چاہے پہن لے، اسی قسم کی اور بھی بہت سی حدیثین ہین، اور ان حدیثون سے پہلے زیب و زینت اور صفائی و پاکیزگی کے متعلق جو حدیثین نقل کیگئی ہین، بظاہر اون کے مخالف ہین، لیکن درحقیقت ان حدیثون مین کسی قسم کا اختلاف و تناقض نہین ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب ان دونون قسم کی حدیثون کو نقل کرکے لکھتے ہین کہ

> ان دونون قسم کی حدیثون مین کوئی اختلاف نہین ہے، کیونکہ اس جگہ درحقیقت دو مختلف چیزین ہین، جو بظاہر مشتبہ معلوم ہوتی ہین، لیکن ان مین ایک چیز تو مقصود ہے اور دوسری مذموم، جو چیز مقصود ہے وہ بخل کا چھوڑنا ہے، لیکن انسانی مدارج کے اختلاف سے بخل مین بھی اختلاف ہو جاتا ہے، مثلاً بادشاہون کیلئے جو چیز بخل مین داخل ہے، وہ ایک فقیر کے حق مین بعض اوقات فضول خرچی مین داخل ہو جاتی ہے، دوسری جو چیز مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ بدؤون اور وحشیون کی عادتین نہ اختیار کیجائین، بلکہ صفائی، پاکیزگی اور عمدہ عادتون کی خو ڈالی جائے، لیکن جو چیز مذموم اور بُری ہے وہ یہ ہو کہ تکلف، نمایش، اور کپڑون پر فخر کرنے مین بہت زیادہ مبالغہ نہ کیا جائے، اور محتاجون کی دلشکنی نہ ہونے پائے، اس قسم کی اور بھی بہت سی باتین ہین، اور حدیث کے الفاظ مین ان باتون کی طرف اشارات پائے جاتے ہین،

(باقی)

اغلبیون کا عدالتی نظام

از

سید ریاست علی ندوی،

اغلبیون کی حکومت، افریقہ مین ۱۸۴ھ (۸۰۰ء) سے ۲۹۶ھ (۹۰۸ء) تک رہی، اس حکومت کے قیام سے پیشتر افریقیہ مرکزی حکومت بغداد کے ایک ماتحت صوبہ کی حیثیت سے تھا، جس پر مصر کی حفاظت کے خیال سے قبضہ رکھنا ضروری سمجھا جاتا تھا، اور اسی لئے خزانۂ مصر سے ایک لاکھ سالانہ کی رقم یہان فوجی نظم و نسق برقرار رکھنے کے لئے خرچ کی جاتی تھی،

جب ۱۸۴ھ مین ابراہیم بن اغلب اس صوبہ کا والی بنایا جانے لگا، تو اوس نے افریقہ کو ایک آزاد صوبہ کی حیثیت مین لانے کیلئے اس رسم کو ترک کرنا چاہا، اور خلیفہ ہارون رشید سے استدعا کی کہ مصر کے خزانے پر ولایت افریقہ کا بار نہ ڈالا جائے، مزید بران خود حکومت افریقہ سے سالانہ چالیس ہزار دینار قبول کئے جائین، ہارون رشید نے یہ تجویز خوشی سے منظور کر لی، اوس وقت سے افریقہ مین گویا ایک مستقل اسلامی حکومت قائم ہوئی، جس کا بانی یہی ابراہیم بن اغلب تھا، اوس کے بعد افریقہ کی یہ حکومت اسی کے خاندان مین متوارث رہی، یہان تک کہ اسماعیلیون نے ۲۹۶ھ مین اس کا خاتمہ کیا،

دولت اغلبیہ کا نظام حکومت اون مختلف شعبون مین تقسیم تھا، جو اوس عہد مین متمدن حکومتون کیلئے ضروری سمجھے جاتے تھے، چنانچہ عدالت و قضا کا صیغہ بھی اون کے نظام حکومت مین جداگانہ قائم تھا، اگرچہ ہماری سنہ وار تاریخون مین اس کا کوئی مستقل تذکرہ نظر نہین آتا تاہم کچھ ان کتابون مین اور زیادہ تر افریقہ کے علماء و ارباب فضل

کے سوانح حیات و تراجم میں اس صیغہ کی تفصیلات کے نشانات ملتے ہیں جن سے اس کے متعلق ایک سرسری اندازہ ہو جاتا ہے،

قضاۃ کا تقرر افریقہ میں دولت اغلبیہ کے قیام سے پیشتر تک قضاۃ افریقہ کا تقرر براہ راست خلفای عباسیہ کرتے تھے، چنانچہ جب پہلا اغلبی والی ابراہیم اپنے عہدہ پر آیا، تو اسوقت عہدۂ قضا پر عبد اللہ بن غانم سرفراز تھے، اور انھیں خود ہارون رشید نے اس عہدہ پر مامور کیا تھا، (معالم الایمان ج ا ص ۲۱)

پھر جب اغلبی حکومت قائم ہوئی، تو قضاۃ کے تقرر کا حق خلفائے عباسیہ سے منتقل ہو کر اغلبی فرمانروا کو حاصل ہو گیا، چنانچہ عبد اللہ بن غانم کی وفات سے جب یہ جگہ خالی ہوئی، تو خود فرمانروائے افریقہ ابراہیم بن اغلب نے اپنے اختیار سے قاضی ابو محرز کو یہ عہدہ سپرد کیا، (معالم ج ۲ ص ۱۹) اغلبی فرمانروا کا یہ نامزد قاضی ساری حکومت کیلئے قاضی القضاۃ ہوتا، جس کا لقب بالعموم "قاضی افریقہ" ہوتا، اور کبھی "قاضی قیروان" (دار السلطنت) بھی کہا جاتا، اور یہی "قاضی افریقہ یا قاضی قیروان" اغلبی حکومت کے محکمۂ "دیوان القضا" کا افسر اعلیٰ ہوتا،

دیوان القضاء

دیوان القضاء میں حسب ذیل تقسیم کا پتہ چلا ہے، دفتر دار القضا، مجلس قضا، قضاۃ صوبہ جات و ولایت، دیوان المظالم اور دار الافتاء، دیوان القضاء کی اصطلاح کا اطلاق اون سب کے مجموعہ پر ہوتا تھا،

دفتر دار القضاء و مجلس قضاء دیوان القضاء کا صدر دفتر جامع قیروان میں تھا، اور یہین مجلس قضا بھی ہوتی تھی،

عمال دفتر اپنے اپنے مشاغل کے لحاظ سے "کاتب صاحب وثائق" "حجاب" وغیرہ کہلاتے، موخر الذکر موجودہ اصطلاحات کے رو سے، گویا موجودہ کچہریوں کے کلرک "منشی" "پیشکار" اور چپراسی ہیں،

یہ کاتب" اور "صاحب وثائق" اپنے زمانہ کے ممتاز اہل علم میں ہوتے تھے، علوم دینیہ، فقہ (قانون اسلامی) اور ادب پر انھیں عبور حاصل ہوتا، مثلاً ابن عذاری حوادث ۲۹۵ھ میں لکھتا ہے،

اسی سال ابو عقال بن خیر فقیہ نے بھی انتقال کیا، وہ اہل عراق (احناف) کے مذہب کے پیرو تھے، اور ابن عبدون کے زمانہ میں اون کے کاتب، (کلرک) تھے، (ابن عذاری ترجمہ اردو ص ۲۰۰)

اسی طرح ایک "صاحب وثائق" کی وفات کے موقع پر لکھتا ہے،

اسی سال (۳۱۹ھ) احمد بن احمد بن زیاد الفارسی **صاحب وثائق** نے قیروان میں وفات پائی، یہ صاحب علم و فضل تھے، عیسیٰ بن مسکین (قاضی القضاۃ افریقیہ) کے زمانہ میں احکام و مراسلات کی کتابت ان کے ذمہ تھی، وثائق، شروط، اور مواقیت صلوٰۃ کے متعلق ان کی تصنیفات بھی ہیں، (رر ص ۲۸۶)

مجلس قضا کا اجلاس ابتدائے عہد سے قاضی ابو محرز (۱۹۱ھ یا ۸۰۶ء) کے ابتدائی زمانہ تک اسی جامع قیروان میں ہوتا رہا، کچھ دنوں کے بعد وہ جامع مسجد کے بجائے اپنے گھر ہی پر مقدمات کی سماعت کرنے لگے، (معالم الایمان ج ۲ ص ۲۰، ۲۳) پھر انھی کے عہد میں اسی عہدہ پر مساوی اختیارات کے ساتھ قاضی اسد بن فرات بھی بعض وجوہ سے مامور کئے گئے، اونھون نے حسب سابق اپنے اجلاس کیلئے جامع قیروان ہی کو منتخب کیا (رر ص ۲۰) اور پھر جب امام سحنون کا زمانہ (۲۳۴ھ تا ۲۴۰ھ) آیا، تو اونھون نے بھی اسی قدیم مقام کو دار القضاء قرار دیا، اور اس کے بعد یہی مقام عہد آخر تک دار القضاء رہا،

امام سحنون نے اپنے عہد میں مسجد ہی کے احاطہ میں عدالت کیلئے ایک مستقل عمارت تعمیر کرائی، اور اسی میں اجلاس کرنے لگے، عمارت کے صدر دروازہ پر دربان ہوتے، جو اشخاص متعلق مقدمہ کے بجز کسی کو اندر نہ جانے دیتے، عدالت کی یہ عمارت بعض تاریخی روایات کی بھی دلچسپ حامل بن گئی جو کہ

اس کے تعمیر کرانے والے امام سحنون مالکی المذہب تھے اور اونھون نے دمشق و بغداد کی روایات کے برخلاف اپنی ذاتی رائے سے عدالت کیلئے ایک مستقل عمارت اگرچہ وہ صحن مسجد ہی مین کیون نہ بنوائی تھی، اس لئے یہ احناف اور مالکیہ کا ایک اختلافی مسئلہ بن گیا، احناف کے پیش نظر غالبًا قضاۃ بغداد کا طرز عمل تھا، وہان بھی قاضی القضاۃ ہمیشہ پایۂ تخت کی مسجد جامع مین اجلاس کرتا رہا، اس لئے اون کے نقطۂ نظر سے اس جداگانہ عدالتگاہ کی ضرورت نہین تھی، چنانچہ افریقہ کی اس عمارت کے ساتھ یہ پیش آیا کہ امام سحنون کے بعد جو قضاۃ افریقہ مالکی المذہب مقرر ہوئے وہ اسی مین اپنا اجلاس کرتے رہے، لیکن جب کوئی حنفی المذہب قاضی مقرر ہوتا تو اس عمارت کو منہدم کرادیتا، اور پھر جب کوئی مالکی قاضی آجاتا تو اس کو از سر نو تعمیر کراتا، معالم مین ہے،

وکان یجلس فی بیت فی الجامع بناہ لنفسہ اذ رای کثرۃ الناس وکثرۃ کلامھم فکان لا یحضر عندہ غیر الخصمین ومن یشھد بینھما وکانت قضاۃ المالکیۃ یحکمون فیھا بعدہ واذا ولی عراقی ھدمھا واذا ولی مدنی بناھا۔ (ج ۲ ص ۵۶)	اور وہ (امام سحنون) جامع مسجد کی ایک عمارت مین اپنا اجلاس کرتے تھے، جسکو خود اونھین نے تعمیر کرایا تھا، کیونکہ اونھین سماعت مقدمہ کے وقت لوگون کی کثرت اوران کی زیادہ گفتگو سے تکلیف محسوس ہوئی، چنانچہ اس کے بعد اون کے سامنے مدعی مدعا علیہ اور اون کے گواہون کے سوا اور کوئی حاضر نہ ہوسکتا تھا، اور مالکی قضاۃ اون کے بعد اسی عمارت مین اجلاس کرتے رہے اور جب کوئی حنفی قاضی آجاتا تو اس کو منہدم کرادیتا، پھر جب کوئی مدنی قاضی مقرر ہوتا،

عدالت مین قاضی القضاۃ کی معیت مین چار دیگر فقہا بھی سماعت مقدمہ کے وقت مشورہ کیلئے بیٹھا کرتے تھے، جسے دور حاضر کی اصطلاح مین "ججون کی بنچ" یا "اسیسرون کی جماعت" کے الفاظ سے تعبیر کرسکتے ہین، اگرچہ ان فقہا، کی حیثیت کسی قدر ان سے مختلف تھی، ان فقہا، کو قضاۃ خود اپنے ساتھ بٹھاتے تھے اور وہ مقدمہ کی مالہ وماعلیہ کی سماعت کرتے، مقدمہ کی سماعت کے بعد قاضی ان سے نقد و نظر کے ساتھ بحث و گفتگو کرتا، جب سب کی رائین اور دلیلین معلوم ہوجاتین، تو مقدمہ کا کوئی فیصلہ کیا جاتا، اس لئے فقہا، کی یہ جماعت نہ تو "ججون کی بنچ" سے کلیۃً مطابق ہے، کہ انھین حق قضارت حاصل نہ تھا، اور نہ اونھین اسیسرون کی جماعت کہا جاسکتا ہے، کہ دور حاضر مین کم از کم ہندوستان کی عدالتون مین اسیسرون کا انتخاب علم و فضل کے اعتبار کے بجائے مالیہ کی کثرت ادائی کے لحاظ سے کیا جاتا ہے، اس کے برخلاف یہ چارون فقہا، اپنے علم و فضل کے اعتبار سے ممتاز ہوتے تھے اور قاضی کے ساتھ کسی خاص قسم کے مقدمون مین شرکت کرنے کے بجائے جیسا کہ اسیسرون مین ہوتا ہے اون تمام مقدمون مین شریک سماعت رہتے جو قاضی کی عدالت مین دائر ہوتے تھے، معالم مین قاضی حماس بن مروان کے متعلق ہے،

واجلس معہ من الفقھاء اربعۃ موسی ابن القطان واباعبد اللہ الضراب وعبد الرحمن الورقۃ و..... وسالھم ان ینظروا مایرد فی مجلسہ ولا یحکم بین خصمین حتی یناظرھم فی قضیتھما (ج ۲ ص ۲۲۴)	اور اپنے ساتھ چار فقہا، موسیٰ ابن القطان، ابو عبد اللہ الضراب اور عبد الرحمن الورقہ..... کو بٹھایا، اور اون سے درخواست کی، کہ اون کے اجلاس مین جو مقدمات زیر سماعت ہون حاضر رہ کر اون پر غور کرین، اور اون سے جب تک فریقین کے قضیہ پر تبادلۂ خیال ع

عورتون کے مقدمات کی سماعت کیلئے ایک خاص دن

بعض قضاۃ افریقہ نے عورتون کے مقدمات کی سماعت کیلئے ایک خاص دن مقرر کردیا تھا، جسمین صرف عورتون کے مقدمات سُنے جاتے تھے، اجلاس مین صرف قاضی

بیٹھتا، حاجب اور دربان اور پیشکار تک مجلس سے رخصت کردیئے جاتے، قاضی ابو محرز کے سوانح حیات مین مذکور ہے،

وکان ابو محرز یجلس الخصوم فی دارہ ویجعل للنساء یوماً عند باب دارہ،

(معالم ج ۲ ص ۲۳)

ابو محرز مقدمات اپنے گھر پر کرتے تھے اور انھون نے عورتون (کے مقدمات) کیلئے ایک خاص دن مقرر کردیا تھا، اوس دن وہ اپنے مکان کے دروازے کے پاس اجلاس کرتے تھے،

اسی طرح قاضی عبد اللہ بن غانم کے تذکرہ مین ہے،

کان یجلس للنساء یوماً ونقله المالکی عن ابی محمد عبد اللہ بن ابی زید عن عبد اللہ بن سعید ابن الحداد عن ابیه وزاد وکان یزیل الکتاب والحجاب من بین یدیه فی ذالك الیوم الذی یجلس فیه للنساء،

(۔ ج ۲ ص ۲۲)

(عبد اللہ بن غانم) ایک خاص دن عورتون کے مقدمات سننے کیلئے بیٹھتے تھے، اس کا تذکرہ مالکی نے ابو محمد عبد اللہ بن ابی زید سے اور انھون نے سعید سے اور سعید نے اپنے باپ حداد سے نقل کیا ہے، اور یہ بھی اس پر مستزاد بتایا ہے، کہ جس دن عورتون کے مقدمے سننے بیٹھتے اوس دن اپنے پاس سے پیشکارون اور دربانون کو علحدہ کردیتے تھے،

مہر عدالت	عدالت کی مہر قاضی کی انگوٹھی مین ہوتی، عدالت کی تمام تصدیقون کا مدار اسی انگوٹھی پر ہوتا،

اس لئے اس انگوٹھی کو قضاۃ کسی وقت جدا نہین کرتے تھے، اور اس کی حفاظت قاضی کے فرائض منصبی مین سمجھی جاتی تھی، فرمانروایان اغالبہ بھی اس کی نگرانی رکھتے تھے، کہ اس مہر کی پوری حفاظت ہوتی ہے، اس سلسلہ مین قاضی ابو محرز کے زمانہ کا ایک دلچسپ واقعہ معالم مین نقل ہے،

قاضی ابو محرز کی طبیعت کسی قدر تنگی واقع ہوئی تھی، وہ جب تک وضو کرنے مین پانی خوب نہ بہالیتے اون کی تشفی نہ ہوتی، اس لئے وضو کرتے وقت انگوٹھی کو پہنے رہنا اون کیلئے دشوار تھا، وضو کے وقت اُن کی انگلی خالی دیکھکر لوگون کو در پردہ شکوک پیدا ہوے، اور کسی نے افواہاً فرمانروا ے افریقیہ ابراہیم بن اغلب تک یہ شکایت پہنچا دی کہ وہ وضو کے وقت انگوٹھی اوتار کر گھر مین رکھدیتے ہین، گھر کی عورتین موقع پاکر جس پر چاہتی ہین، مہر لگا لیتی ہین، ابراہیم کو یہ سنکر جستجو ہوئی، چنانچہ ایک دن قاضی ابو محرز وضو کرنے مین مصروف تھے، کہ ابراہیم کے دو خدام خاص اچانک آپہنچے، اور اون سے برجستہ سوال کیا، کہ امیر دریافت فرماتے ہین کہ اس وقت آپ کی انگوٹھی کہان ہے،؟ قاضی ابو محرز نے اپنا وضو جاری رکھتے ہوے اپنا ایک ہاتھ گردن کے پاس لیگئے، اور سینے پر سے ایک ڈور اوٹھا کر دکھائی اور کہا یہ دیکھو یہ ڈور مین بندھی ہوئی میری گردن مین لٹکی ہے،" (معالم ج ۲ ص ۲۴)

قضاۃ صوبہ جات و ولایت،	قاضی القضاۃ افریقیہ، افریقیہ کی دوسری ولایتون اور صوبون کیلئے قاضی مقرر کرتے تھے، چنانچہ افریقیہ کی مختلف ولایتون صقلیہ، طرابلس، اور زاب وغیرہ کے قضاۃ انھی کے مقرر کردہ ہوتے،

ان قضاۃ کا کبھی کبھی تبادلہ بھی ہوتا، اور انھین معزول بھی کرنے کا اختیار تھا، ولایتون کی قضاۃ سے مراد ساری ولایت کی قضات تھی، مثلاً ابو العباس اسحق بن ابراہیم ازدی کے سوانح مین ہے،

ولی قضاء الزاب لعیسی بن مسکین ثم ولاہ حماس قضاء طرابلس وکان عدلا فی احکامہ واراد بالزاب ای وسائر عمالته لقول التیجی ولی قضاء الزاب وطنجة وباغایة لعیسی بن مسکین ایام ابراهیم بن احمد

عیسی بن مسکین (قاضی القضاۃ) کے عہد مین زاب کے قاضی مقرر ہوے، پھر انھین حماس نے طرابلس کی قضات پر مامور کیا، یہ اپنے فیصلون مین عدل وانصاف کرتے تھے، اور زاب سے مراد اس کا پورا صوبہ ہے، کیونکہ تیجی کا بیان تصریح سے ہے کہ زاب، طنجہ اور باغایہ کی قضات

وولاہ حماس القضاء ایام زیادۃ — عیسیٰ بن مسکین کی طرف سے ابراہیم بن احمد کے

اللہ قضاء اطرابلس۔ — عہد حکومت میں ملی، اور حماس نے ان کو زیادۃ

(معالم ج ۲ ص ۲۲۷) — اللہ کے زمانہ میں طرابلس کا قاضی مقرر کردیا

ولایت کے یہ قضاۃ اپنے صوبہ کے دیوان القضاء کے افسر اعلیٰ ہوتے، ان کے یہاں بھی عمال دفتر علحدہ ہوتے، اور یہ خود اپنے صوبہ کے مختلف شہروں کیلئے قاضی مقرر کرتے، اور ان کے عزل و نصب کا اختیار انہی کو ہوتا،

ولایتوں کے قاضیوں کی اگر شکایتیں ہوتیں، تو وہ قاضی القضاۃ تک پہنچتیں تھی یا تو وہ تحقیقات کرتے، یا اگر بے محل شکایتیں ہوتیں تو رد کردیتے،

دیوان نظر المظالم نظر المظالم کا علحدہ محکمہ اسی دیوان القضاء کے ماتحت قائم تھا، اس میں دو قسم کے مقدمات پیش ہوتے، ایک تو عمال و کارپردازان حکومت کی زیادتیوں کی وہ شکایتیں اس میں سنی جاتیں جو اون سے اپنے عہدہ کے فرائض کی انجام دہی میں سرزد ہوتیں، دوسرے بازار کے معاملات خرید و فروخت لین دین ناپ تول، اور بیع و شرا میں جو زیادتیاں اور اختلافات ہوتے، اون کی دادرسی اور فیصلے کئے جاتے، او شہر کی آبادی والے، اپنے کسی حق سے تجاوز کرتے تو اون کی گرفت ہوتی، یا کوئی ایسے فعل کا مرتکب ہوتا جو شہر کے باشندوں کی تکلیف کا باعث ہوتا تو بھی اوس کی گرفت ہوتی،

اس صیغہ کی پہلی قسم کے کاموں کے متعلق بالعموم مورخین اسلام نے تذکرہ کیا ہے، دوسری قسم کے کاموں کی تفصیل ذیل کے اقتباس سے ہوگی، معالم میں ابوالقاسم محمد بن محمد بن خالد القیسی المعروف بہ طرزی کے سوانح حیات میں ہے،

ولاہ عیسیٰ بن مسکین علی مظالم — انہیں عیسیٰ بن مسکین نے مظالم قیروان پر مقرر

القیروان وولاہ حماس بعد عشر — کیا، پھر حماس نے انہیں قضاءت سپرد کی، دس

سنین... المراد بالمظالم احکام السوق (جلد ۳ ص ۸) — سال تک اور مظالم سے مراد بازار کے احکام ہیں:

طرزی نے بازار میں بڑی خوبی سے نظم و ضبط قائم کیا، چنانچہ صاحب معالم کا بیان ہے،

لم یل اسواق القیروان قبلہ اضبط — قیروان کے بازاروں میں اس سے پہلے کسی

منہ۔ — نے اسقدر ضبط و نظم قائم نہیں کیا،

چنانچہ ایک مرتبہ جب وہ اپنے عہدے پر سرفراز تھے، قیروان کے بازار میں گذر رہے تھے ایک مقام پر جامع مسجد کے سامنے بڑی مقدار میں پانی بہتا نظر آیا جس سے راستہ کی آمد و رفت میں زحمت پیش آتی تھی، یہ فوراً وہیں رک گئے، تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ امام جامع مسجد کا یہ فعل ہے، اُن کے کوئیں میں چوہیا گرگئی ہے، بلاکر دریافت کیا، اور راستہ کی آمد و رفت روکنے کے جرم میں اس عظیم المرتبت شخصیت کو بھی قیدخانہ بھیج دیا، جب ظہر کی نماز کا وقت آیا، لوگوں کو امام کی تلاش ہوئی، اور لوگ ان کے پاس سفارشی بن بن کر آنے لگے، کہ جرم سے چشم پوشی کیجائے، اور اون کو رہا کردیا جائے، آخر انہیں قیدخانہ سے نکالنے کا حکم دیا، جب سامنے آئے تو کہا اگر تم امام نہ ہوتے، اور لوگ تم سے مستغنی ہوتے، تو میں تمہیں قید سے باہر نہ نکالتا،، (معالم ج ۳ ص ۸)

اسی لئے محکمہ مظالم کا یہ عہدہ معزز عہدوں میں شمار ہوتا، اور ممتاز اہل علم اس پر سرفراز کئے جاتے تھے، چنانچہ قیروان کے محکمہ مظالم پر حبیب بن نصر تمیمی (۲۲۷ھ) ابو العباس بن خداش تمیمی الفقیہ متوفی ۲۹۶ھ ابو العباس احمد بن ابراہیم بن احمد بن اغلب (۲۸۳ھ) وغیرہ جیسے ممتاز فقہاء کے نام ملتے ہیں، (ابن عذاری ترجمہ اردو ص ۱۴۹، ص ۱۹۶، ص ۲۰۰،)

محکمہ مظالم میں جو فقہاء و قضاۃ عہدیدار تھے، اون کے مناصب مقرر تھے، اونکے محدود و متعین اختیارات کے لحاظ سے اوسی نوعیت کے مقدمات اون کی عدالت میں دائر ہوتے تھے، یعنی استغاثہ میں مالیت کی تعداد و مقدار کے لحاظ سے ان قضاۃ کو مقدمات کی سماعت کا حق حاصل تھا، قاضی ابو الزبیع سلیمان

بن سالم کندی المعروف بابن کحالہ، عیسیٰ بن مسکین کے عہد مین قیروان کے محکمہ مظالم مین تھے، ان کے متعلق تصریح ہے:۔

وولاہ ابن طالب قضاء باجۃ اعمالھا وولاہ عیسیٰ بن مسکین مظالم القیروان واذن لہ ان ینظر فی مائۃ دینار (معالم ج ۲ ص ۱۳۴)

ابن طالب نے انھین باجہ اور اوس کے صوبہ کا قاضی مقرر کیا، اور پھر عیسیٰ بن مسکین نے انھین مظالم قیروان پر مامور کیا، اور اجازت دی کہ سو دینار تک کے مقدمات ف

محکمۂ افتاء صیغۂ افتاء بھی دیوان القضاء کے ماتحت تھا، مفتی شہر کا تقرر بھی قاضی القضاۃ کرتا جس کے فتاوے شرعی مسائل مین نافذ ہوتے، مفتی کا انتخاب قضاۃ چھان بین کے بعد کرتے، اور تقرر سے پہلے امتحان لے کر تشفی کر لیتے، مثلاً قاضی عبد اللہ بن طالب کے عہد مین محمد بن سحنون افتاء کی خدمت انجام دیتے تھے، اون کی وفات کے بعد فقیہ ابو العباس اس خدمت کو انجام دینے بیٹھے، مگر ابن طالب نے انھیں اس سے روک دیا، اور پہلے اونکی آزمائش کی، اسکے بعد اجازت عطا کی، معالم مین ہے:

وللمامات محمد بن سحنون جلس ابو العباس للفتیا فانکر عبد اللہ بن طالب القاضی ثم بعث الی ابی الفضل السوسی ان یختبرہ فالقی علیہ کتاب الفرائض فاجاب عنہ کلہ فاباح لہ ابن طالب الفتیا، (معالم ج ۲ ص ۲۲)

محمد بن سحنون کی وفات کے بعد ابو العباس افتاء کی خدمت انجام دینے بیٹھے، مگر قاضی عبد اللہ بن طالب نے اونھین اس خدمت سے روک دیا، اور ابو الفضل سوسی کو اونکے امتحان کیلئے روانہ کیا، چنانچہ وہ ابو العباس کے پاس آئے اور کتاب الفرائض بطور امتحان اون کے سامنے پیش کی، سب کا اونھون نے جواب دیا، اور ابن طالب نے اون کی خدمت افتاء کو منظور کیا،

قوانین حکومت اسلامی قانون، قرآن مجید، احادیث، قاضی کی ذاتی رائے، یعنی اجتہاد یا قیاس سے عبارت ہے، اور اسی کا مجموعہ فقہ کہلاتا ہے، اغالبہ کے عہد حکومت تک فقہ کے مذاہب اربعہ مین ایسی عصبیت پیدا نہین ہوئی تھی، کہ ان کا اجتماع ممکن نہ ہوتا، اس لئے سلطنت اغالبہ کا قانون فقہ حنفی یا فقہ مالکی کے بجائے محض فقہ اسلامی تھا، اسی لئے عہدۂ قضاء پر کبھی مالکی المذہب مقرر ہوتے تھے کبھی حنفی المذہب متعین کئے جاتے، علاوہ ازین یہ بھی کوئی ضرور نہ تھا کہ اگر قاضی القضاۃ مثلاً مالکی ہے، تو اپنے ماتحت صوبہ کے قضاۃ بھی مالکی المذہب ہی مقرر کرے، بلکہ یہ بھی ضرور نہ تھا کہ قاضی مدعی و مدعا علیہ کے مسلک فقہ کے مطابق فیصلے کرنے پر مجبور ہوتا، بلکہ اونھین اختیار رہتا تھا، کہ وہ اپنے فہم و بصیرت کے لحاظ سے جو کچھ حق و دیانت سمجھین، اوسی کے مطابق فیصلے کرین، خواہ مدعی و مستغیث یا مدعا علیہ فقہ اسلامی کے مذاہب مین سے کوئی مذہب بھی رکھتا ہو،

چنانچہ امام سحنون نے اپنے عہدۂ قضاۃ مین قاضی سلیمان بن عمران کو جو بعد مین قاضی القضاۃ بھی بنے، ولایت بجایہ کا قاضی مقرر کیا، سلیمان مسلکاً حنفی تھے، اور اہل بجایہ مین ایک بڑی تعداد مالکی المذہب تھی، آخر باشندگان بجایہ کی ایک جماعت امام سحنون کے پاس شکایت لیکر آئی کہ سلیمان اپنے مذہب حنفی کے مطابق فیصلے کرتے ہین، امام سحنون نے اوس کے جواب مین کہا:۔

ماقدمتہ علیکم الا وانا اعلم انہ یحکم بمذھبہ۔ (ج ۲ ص ۹۹)

مین نے جب انھین تمھارے صوبہ مین بھیجا، تو یہ جان کر بھیجا کہ وہ اپنے ہی مذہب (حنفی) کے مطابق فیصلے کرین گے،

شکایت لیکر آنے والا گروہ خاموشی سے واپس چلا گیا، (ج ۲ ص ۹۹) یہی وجہ ہے کہ اغالبہ کے عہد مین افریقہ مین مذہب مالکی کی مقبولیت کے باوجود اکثر فقہاء حنفی المذہب تھے، معالم مین ہے:۔

ان اکثر الفقھاء اذ ذلک علی رای الکوفیین (ج ۲ ص ۹۵)

کیونکہ اکثر فقہاء اوس زمانہ مین حنفی المذہب تھے،

لیکن اس کے باوجود حنفی و مالکی اختلافی مسائل کی بنا پر بہت کم اختلافات ملتے ہیں، البتہ اختلاف اور عصبیت کی جھلک کلام و عقائد میں نظر آتی ہے، کیونکہ اغلبی عہد میں امرائے دولت میں سے غالب تعداد معتزلہ کی تھی، معالم میں ہے،

اکثرھم (ای رجال ابن اغلب) کانوا معتزلۃ (ج ۲ ص ۱۷) اکثر رجال ابن اغلب معتزلی تھے،

یہ اختلافی عقائد ایسے تھے جن کی نوبت تکفیر تک پہنچی تھی اور ایک دوسرے کو صدق دل سے کافر سمجھتے تھے، اسلئے اکثر اس کے اثرات بھی ظاہر ہو جاتے تھے، اور وہ افریقہ کے دیوان القضاء میں بھی ظاہر ہوئے، لیکن ان کے تفصیلات کی چنداں ضرورت نہیں،

بیجی القضاۃ قاضی القضاۃ کو اگرچہ فرمانروایان اغالبہ نامزد کرتے تھے، مگر وہ تمام معاملات میں آزاد و خود مختار ہوتے، اونھیں اس کا حق حاصل تھا، کہ جب وقت چاہتے، فرمانرواؤں کے پاس جا سکتے، خواہ حرم میں ہون یا دیوان عام میں، وہ ہر وقت امیر سے تخلیہ کر سکتے تھے، اور امیر وقت خواہ نیند میں ہو یا بیداری میں بہ اطلاع کر کر فوراً باریاب ہو جاتے، کسی حاجب و دربان کو اس کی اجازت نہ تھی، کہ یہ جب محل شاہی تک پہنچیں، تو امیر سے اون کی ملاقات کسی دوسرے وقت کیلئے ملتوی کر دے، وہ اکثر معاملات میں حکومت کے خلاف مقدمات سنتے، اور حکومت اور خود امیر کی ذاتی خواہش اور مرضی کے خلاف فیصلے کرتے، کبھی کبھی قاضی القضاۃ اور فرمانروائے افریقہ میں سخت اختلافات پیش آجاتے، امیر افریقہ کسی مقدمہ میں کوئی خاص فیصلہ کرنے یا مقدمہ اٹھا لینے کی خواہش کرتا، اور قاضی القضاۃ سختی سے تعمیل حکم سے انکار کر دیتا، ورنہ بصورت مجبوری اپنا استعفا پیش کر دیتا، جسے امیر واپس کرنے پر مجبور ہوتا، کہ اولاً اوس وقت اس عہدے کیلئے اوس سے بہتر شخص کوئی موجود نہ ہوتا، دوسرے استعفا منظور کرنے میں فرمانروا کے عدل و انصاف کی بدنامی ہوتی، اوس کی بکثرت مثالیں افریقہ کے قاضی القضاۃ کی سوانح عمریوں میں ملتی ہیں،

افریقہ کے قضاۃ کی جو فہرست بہ ترتیب زمانہ مرتب ہو سکی، وہ حسب ذیل ہے:-

شمار	نام قضاۃ	زمانۂ تقرر	زمانۂ علیحدگی	کیفیت
۱	عبداللہ بن غانم،	۱۷۱ھ	۱۹۰-۶ھ	ابراہیم بن اغلب کے زمانۂ
۲	ابومحرز،	۱۹۱ھ	۲۱۴ھ	حکومت کے آغاز سے
۳	اسد بن فرات،	۲۰۳ھ	۲۱۳ھ	پیشتر روح بن حاتم کے
۴	احمد بن ابومحرز،	۲۲۰ھ	۲۲۱ھ	زمانہ میں تقرر ہوا تھا،
۵	عبداللہ بن ابی الجواد	۲۲۱ھ	۲۳۲ھ	
۶	امام سحنون،	۲۳۴ھ	۲۴۰ھ	ابن عذاری میں زمانۂ تقرر ۲۳۳ھ ہے
۷	سلیمان بن عمران،	۲۴۰ھ	۲۵۷ھ	" " ۲۴۲ھ ہے
۸	ابن طالب،	۲۵۷ھ	۲۵۹ھ	
۹	سلیمان بن عمران،	۲۵۹ھ	۲۶۹ھ	" " ۲۶۷ھ ہے
۱۰	ابن طالب،	۲۶۹ھ	۲۷۵ھ	" " ۲۶۷ھ ہے
۱۱	محمد بن عبدون بن ابی ثوب،	۲۷۵ھ	.	
	المعروف بہ محمد بن عبداللہ الرعینی،	.	.	
۱۲	صدینی،	.	.	
۱۳	عیسیٰ بن مسکین،	.	.	متوفی ۲۹۵ھ مدت ولایت قضاء ۸ سال یعنی
۱۴	حماس بن مروان،	.	.	
۱۵	محمد بن احمد بن جمال،	۲۹۴ھ	۲۹۶ھ	ابن عذاری میں ان کا نام محمد بن عبداللہ المعروف بہ ابن حیان ہے (ص ۱۹۱) و محمد بن حیان (ص ۱۹۶) و ابوالعباس بن حیمان (ص ۱۹۵) ہے

نفسیات حکیم ناصر خسرو

(۳)

از

پروفیسر سید ولی الرحمٰن، ایم اے، استاذ نفسیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن،

(۵)

اثبات وانکار لذت والم کو حکیم ناصر خسرو نے اپنے فلسفہ مذہب میں بہت اہمیت دی ہے، اسی وجہ سے ان
نے اس موضوع پر کافی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، ان کا خیال ہے کہ "اندر شناخت لذت مرنفس را پندار یست
و قوت حق و دین و ضعف شک و الحاد اندر آنست" [۱] اس کے علاوہ "اندر اثبات لذت قوت دین و ضعف الحاد است
کہ بنیاد دین حق بر ایجاب بہشت است مر مطیعان و نیکوکاران را کہ آن معدن غایت لذت است و آنجا رنج نیست
البتہ ...... و نیز بر الزام دوزخ است مر عاصیان و بدکرداران را کہ آن مکان نہایت رنجہاست و آنجا
ہیچ لذت نیست البتہ" [۲] آخری عبارت جو ہم نے نقل کی ہے، اس میں یہ خیال بہت اہم ہے، کہ بہشت [۳] معدن لذت
ہے کہ جس میں رنج نہیں، اور دوزخ معدن رنج ہے کہ جس میں لذت نہیں، اسی خیال کو اوس نے لذت والم کے اس

[۱] زاد المسافرین ص۲۳۹، [۲] زاد المسافرین ص۲۳۲، [۳] بہشت و دوزخ کے وجود کو حکیم ناصر خسرو نے بڑے عجیب و غریب طریقے سے
ثابت کیا ہے، کہتے ہیں کہ اخلاق ستودہ یعنی عدل و انصاف، راست گوئی، امانت میں خیانت نہ کرنا وغیرہ سب کے سب بہشت کے وعدے
اور دوزخ کی وعید کی وجہ سے ظاہر ہوتے ہیں، یعنی یہ کہ یہ اخلاق معلولات ہیں اور بہشت و دوزخ علل (القول شائع علل غائیہ) ص ۵۰۵
اب ان اخلاق کا وجود تو مسلّم ہے، بالفاظ دیگر معلولات موجود ہیں، اور معلول کا وجود علت کے وجود کو مستلزم ہے، یہ محال ہے کہ معلول ہو
اور علت نہ ہو، لہذا علت بھی موجود ہے یعنی بہشت و دوزخ موجود ہیں (ص ۲۳، ۲۳۱)

نفسیاتی نظریے کی بنیاد قرار دیا ہے، جس کا وہ قائل ہے، یہاں بھی اوس نے سلبی طریقہ اختیار کیا ہے، یعنی محمد زکریا
رازی [۱] اور اس کے بیٹے نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کی تردید کی ہے، لیکن خود اپنے آپ کوئی خاص تعمیری
نظریہ قائم نہیں کیا،

محمد زکریا رازی کا نظریہ لذت والم مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:-

لذت دراصل رنج (یا الم) سے نجات پا جانے کی حالت کا دوسرا نام ہے، یعنی یہ کہ لذت ہمیشہ رنج کے بعد
پیدا ہوتی ہے، اس کے علاوہ اگر لذت ایک خاص مدت تک باقی رہے تو یہ رنج بن جاتی ہے، جس حال کو نہ لذت
کہا جا سکتا ہے نہ رنج، وہ طبیعت ہے، اور اس کو حس سے معلوم نہیں کیا جا سکتا، لذت حسّی تو رہائی دلانے والی ہوتی ہے
اور درد حسّی رنج دلانے والا، لیکن لذت والم پیدا کس طرح ہوتے ہیں؟ اس کا جواب رازی نے لذت و
الم اور حس کے تعلق کی توضیح سے دیا ہے، پہلے وہ سوال کرتا ہے کہ حس کسے کہتے ہیں؟ حس ایک اثر ہے، جو محسوس
کی وجہ سے صاحب حس میں پیدا ہوتا ہے، [۲] یہ تاثیر ایک فعل ہے، جو اثر کنندہ اثر پذیر میں کرتا ہے، اثر پذیری
اثر پذیر کے حال کے متغیر ہو جانے کا دوسرا نام ہے، اب یہ حال جو حالت اثر پذیری میں متغیر ہوتا ہے یا تو طبیعت

[۱] ایران اور مسلمانوں کا مشہور فلسفی ہے، حکیم ناصر خسرو اس سے بہت ناراض ہیں، ان کے نزدیک الحاد و مخالفت رائے اور
دنائت طبع ان کی خصوصیات امتیازی ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:- "محمد زکریا چندان سخن ملحدانہ گفتہ" (ص۱۱) "...... باین نتیجہ ش
دروغ زن و حرامزادہ آمد" (ص۹۸ اور ص۲۳۶) "...... پس چنین سخن گفتن فلسفہ نباشد، بلکہ عرضہ کردن جہل و سفاہت باشد" (ص۲۳۰)
ڈاکٹر جمن کا خیال ہے کہ اس تشدد اور ناراضگی کی وجہ یہ ہے کہ "اقوال محمد زکریا مطابق اقوال حرانیین است کہ قائل پنج قدیم ہستند باین معنی کہ چہار
چیز دیگر را در قدم شریک باری میدانستند...... و معلوم است کہ این عقیدہ مخالف مذہب خداپرستی حکیم ناصر خسرو است" (مقدمہ مصحح ص د)
[۲] یہ تعریف گرانٹ ایلن کی تعریف کی یاد تازہ کرتی ہے، Organic substance act-
ed upon by peculiar agencies in the inorganic wo-
rld give rise to the phenomena of sensation دیکھو
Colour-sense ص ۲.

سے ہوتا ہے، یا طبیعت سے باہر، ان تمام مقدمات کے مسلّم ہوجانے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ جب اثر کنندہ اثر پذیر کو اس کے طبیعی حال سے باہر کر دیتا ہے، تو رنج (یا الم) پیدا ہوتا ہے، اور جب اثر پذیر اپنے طبیعی حال کی طرف عود کرتا ہے تو لذت پیدا ہوتی ہے، اسی سے ثابت ہے کہ لذت ہمیشہ رنج کے بعد پیدا ہوتی ہے، کیونکہ اپنی اصلی طبیعت کی طرف عود کرنا طبیعت سے باہر ہوئے بغیر محال ہے، طبیعی حال یعنی وہ حال جو نہ لذت ہے نہ رنج اس لئے محسوس نہیں ہو سکتا، کہ محسوس ہونا تاثیر کا نتیجہ ہوتا ہے، اور تاثیر سے جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، یا تو انسان طبیعی حال سے باہر ہو جاتا ہے، یا اس کی طرف عود کرتا ہے، یعنی حال طبیعی سے مراد یہ ہے کہ انسان نہ تو طبیعت سے باہر ہے، نہ اس کی طرف عود کرے، تاثیر میں یہ صورت محال ہے، اور بغیر تاثیر حس محال ہے، لہذا حال طبیعی میں حس محال ہے،

اس کے علاوہ یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اگر ایک تاثیر کے بعد دوسری تاثیر ہو، اور یہ دونوں تاثیریں ایک دوسری کی ضد ہوں، تو اثر پذیر کو لذت حاصل ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی تاثیر کی وجہ سے اثر پذیر اپنی طبیعت سے باہر ہو جاتا ہے، اور دوسری تاثیر چونکہ پہلی تاثیر کی ضد ہے، لہذا اس سے پہلی تاثیر زائل ہو جاتی ہے، اور اس طرح اثر پذیر اپنی طبیعت کی طرف عود کر آتا ہے جس سے لذت حاصل ہوتی ہے، لیکن چونکہ دوسری تاثیر پہلی کو زائل کر کے خود باقی رہتی ہے، لہذا اثر پذیر اس دوسری تاثیر کی وجہ سے پھر اپنی طبیعت سے باہر ہو جاتا ہے، یعنی اثر پذیر میں حالت رنج پیدا ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اثر پذیر کا حال طبیعی طبیعت سے باہر ہونے اور طبیعت کی طرف عود کرنے کی درمیانی حالت ہے، یعنی یہ وہ حالت ہے، جو نہ لذت ہے نہ رنج[1]،

محمد زکریا رازی کے بیٹے نے اپنے باپ کے نظریے کی تشریح اس طرح کی ہے:-

کہتا ہے، فرض کرو ایک شخص ایک ایسے کمرے میں ہے، کہ جس میں نہ اتنی سردی ہے کہ وہ کانپنے لگے اور نہ اتنی گرمی ہے کہ پسینہ پسینہ ہو جائے، اس شخص کو اس کمرے میں نہ گرمی لگتی ہے، نہ سردی یعنی یہ اس کا حال طبیعی ہے، فرض کرو کہ ہم اچانک اس کمرے کو اتنا گرم کر دیں کہ اس کو تکلیف ہونے لگے، اور اس کے بعد اس میں آہستہ

[1] زاد المسافرین ص۲۳۲، ص۲۳۵،

آہستہ ٹھنڈی ہوا داخل کریں، اس کو گرمی کی تکلیف کے بعد ٹھنڈک کی لذت محسوس ہوگی، کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ گرمی سے وہ اپنے حال طبیعی سے باہر ہو گیا تھا، اور ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے اپنے حال طبیعی کی طرف عود کر آیا، اب فرض کرو کہ ہم یہ ٹھنڈی ہوا برابر پہنچاتے رہیں، تو کیا ہوگا؟ وہ شخص پھر اپنے حال طبیعی سے باہر ہو جائے گا، اور اسی طرح اس کی تکلیف پھر شروع ہو جائیگی، اس کے بعد اگر ہم اس کمرے کو گرم کریں گے، تو اس کو لذت محسوس ہوگی، کیونکہ اس گرمی کی وجہ سے وہ پھر اپنے حال طبیعی کی طرف عود کریگا، وقس علی ہذا،

اس مثال سے واضح ہوتا ہے، کہ لذت حسی حالت رنج سے خلاصی پا جانے کی وجہ سے راحت پیدا ہونے کی حالت ہے، پھر جب آدمی اپنی طبیعت سے باہر تو آہستہ آہستہ ہے اور عود یکدم کرے تو لذت پیدا ہوتی ہے، لیکن جب وہ یکدم طبیعت سے باہر اور عود آہستہ آہستہ کرے تو درد و رنج پیدا ہوتا ہے، مثال اس کی ایسی ہے، کہ ایک شخص بہت سخت بھوکا اور پیاسا ہے، اور یکبارگی کھانا کھالے اور پانی پی لے، تو اس کو لذت حاصل ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے وہ طبیعت سے باہر تو آہستہ آہستہ ہوا تھا، لیکن کھا اور پی کر عود اس نے یکبارگی کیا، اسی طرح اگر کسی تندرست شخص کو چوٹ لگ جائے، تو وہ اپنے حال طبیعی سے گویا یکبارگی باہر ہو جاتا ہے اسی وجہ سے اس کو درد ہوتا ہے، اور چونکہ وہ اچھا آہستہ آہستہ ہوتا ہے، یعنی اپنے حال طبیعی کی طرف عود آہستہ آہستہ کرتا ہے، لہذا اس کو لذت کوئی محسوس نہیں ہوتی، مختصر یہ کہ طبیعت کی طرف یکبارگی عود کر آنے کا نام لذت ہے، اور طبیعت سے یکدم باہر ہو جانے کا نام رنج یا الم[1]،

اس طرح محمد زکریا رازی کا نظریۂ لذت و الم مختصراً یہ ہے کہ لذت حسی رفع رنج کے سوا اور کچھ نہیں، اور رنج طبیعت سے باہر ہو جانے کے ہم معنی ہے، اور لذت طبیعت کی طرف عود کر آنے کے، لیکن طبیعت کی طرف عود کرنا طبیعت سے باہر ہو جانے سے قبل محال ہے، لہذا لذت لازماً رنج کے بعد ہوتی ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ رازی نے اپنے مقالے کے آخر میں کہا ہے، کہ انسان کو روشنی کی طرف دیکھنے سے لذت حاصل ہوتی ہے، لیکن اگر وہ روشنی کو بہت دیر تک

[1] زاد المسافرین ص۲۳۳، ص۲۳۴،

دیکھتا ہے، تو پھر اندھیرے کو دیکھنے سے بھی لذت یاب ہوتا ہے، رازی کا یہ قول خود اس کے اپنے نظریے کا نقیض ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اس کے نزدیک لذت ہمیشہ رنج کے بعد ہوتی ہے، اور یہ طبیعت سے باہر ہو جانے کے بعد اس کی طرف عود کرآنے کا دوسرا نام ہے، اور طبیعت لذت و رنج کی درمیانی حالت ہے، جو محسوس نہیں ہوتی، اب سوال یہ ہے کہ روشنی اور اندھیرے کو دیکھنے کی دو حالتوں کے درمیان وہ کونسی حالت ہے، جسے رازی طبیعت کہے گا؟ جب انسان روشنی کے دیکھنے سے لذت یاب ہوتا ہے، تو وہ کونسی طبیعت ہے جس کی طرف عود کرتا ہے؟ جواب صرف یہی ہو سکتا ہے، کہ چونکہ وہ روشنی کو دیکھنے سے لذت پاتا ہے، اور لذت میں اپنی طبیعت کی طرف عود کرتا ہے لہذا روشنی کو دیکھنا طبیعت ہے، اگر یہ صحیح ہے تو پھر اندھیرے کو دیکھنے سے اکی لذت نہ ہونی چاہئے، کیونکہ اس میں وہ اپنی طبیعت سے باہر ہو جاتا ہے، جو حالت رنج ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اس کا مقدم غلط ہے یا نتیجہ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ غور ہے، کہ روشنی کو دیکھنے کے وقت انسان کی وہ حالت نہیں رہتی جو روشنی دیکھنے کے قبل اس کی ہوتی ہے، یعنی روشنی دیکھنے میں اس کی اصلی حالت بالفاظِ دیگر طبیعت بدل جاتی ہے اور اس طرح وہ اپنی طبیعت سے باہر ہو جاتا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو روشنی کو دیکھنے سے اس کو لذت کیوں ہوتی ہے، پھر رازی نے اس بات کی طرف بھی توجہ نہیں کی، کہ دیکھنے اور نہ دیکھنے کے درمیان کوئی ایسی حالت نہیں، جو دیکھنے کی حالت بھی نہ ہو، اور نہ دیکھنے کی بھی نہ ہو، اور جس کو بقول اوس کے طبیعت کہا جا سکے، جسمیں نہ رنج ہو تا ہے اور نہ لذت، ایک جگہ رازی نے لکھا ہے کہ خوبصورت عورت کو دیکھکر آدمی کو لذت اس لئے حاصل ہوتی ہے، کہ بدصورت عورت کو دیکھنے سے اس کو تکلیف ہو چکی ہوتی ہے، اس کا یہ قول بھی سخت رکیک اور بے معنی ہے، ہم کو خوبصورت عورت کو دیکھنے سے لذت اس وجہ سے حاصل نہیں ہوتی، کہ ہم بدصورت عورت کو دیکھتے دیکھتے عاجز آچکے ہوتے ہیں، یہ لذت تو انسان کے لئے فطری ہے، اس کے علاوہ یہ بھی اس کے نظریے کے خلاف ہے، اگر اس کا نظریہ صحیح ہے، تو ہونا یہ چاہئے تھا، کہ جو شخص نہ تو خوبصورت عورت کو دیکھتا نہ بدصورت عورت کو وہ اپنے طبیعی حال پر ہوتا، اس لحاظ سے خوبصورت عورت کو دیکھنے سے اسے رنج ہونا چاہئے تھا، کیونکہ

اسمیں وہ اپنی طبیعت سے باہر ہو رہا ہے، اور بدصورت عورت کو دیکھنے سے اسکو لذت ہونی چاہئے تھی، کیونکہ اسمیں وہ اپنی طبیعت کی طرف عود کرتا ہے، لیکن حقیقتِ حال اس کے برعکس ہے ان تمام شواہد سے ظاہر ہے کہ رازی کا یہ نظریہ صحیح نہیں، کہ طبیعت کی طرف عود کرآنے کا نام لذت ہے[1]

ایک شخص کسی خوبصورت عورت کو پہلی مرتبہ دیکھتا ہے اس کو دیکھنے سے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے، حالانکہ جیسا اودھر کہا جا چکا ہے، اس کو رنج ہونا چاہئے تھا، اب فرض کرو کہ یہ عورت اس کی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو جاتی ہے اس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے، حالانکہ چونکہ وہ اپنے طبیعی حال کی طرف عود کر آیا ہے، لہذا اس کو لذت حاصل ہونی چاہئے تھی، یعنی یہ حالت بھی رازی کے نظریے کے خلاف ہے[2] بہترین تردید اس نظریے کی اس طرح ہو سکتی ہے، کہ ایک تندرست اور سلیم الحواس شخص کو اس کے منہ میں شکر کا ڈلا دو، اس کے سامنے ایک گلدستہ اور مشک نافہ رکھو اس کے قریب بہت عمدہ گانا گاؤ، نہایت خوبصورت دیبائے منقش کی چادر اس کی آنکھوں کے روبرو پھیلاؤ، اور نہایت نرم باریک کپڑے کا لباس پہنادو، اس طرح اس کا تمام طبیعی حال متغیر ہو جائیگا، اب اس نظریے کے مطابق جب طبیعی حال اس طرح متغیر ہو جاتا ہے تو رنج پیدا ہوتا ہے، لہذا اوس شخص کو بھی سخت تکلیف ہونی چاہئے تھی، لیکن عقلاء دہر جانتے ہیں کہ اس سے اس کو تکلیف نہیں، بلکہ لذت حاصل ہوتی ہے، اگر رازی کا نظریہ صحیح ہوتا، تو دنیا میں مکروہ اور تکلیف دہ چیز کا نام بھی باقی نہ رہتا،[3]

واقعہ یہ ہے کہ رازی نے لذت اور "راحت از رنج" میں خلط مبحث کیا ہے، یہ دونوں ایک ہی چیزیں نہیں، بلکہ دو مختلف چیزیں ہیں، لذت تو وہ حالت ہے کہ جب انسان اپنے حالِ طبیعی سے اس حالت میں آتا ہے، تو شادمان اور خوش ہوتا ہے، اور جب اس حالت تک نہیں پہنچ سکتا تو رنج اور تکلیف اوٹھاتا ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص "درویشی و گرسنگی و تشنگی و تنہائی" کی حالت کے بعد "تونگری، طعام و شراب و مونس" پالیتا ہے، تو شادمان اور خوش ہوتا ہے، اور جب وہ ان چیزوں کو نہیں پا سکتا، تو اپنی پچھلی حالت پر رہتا ہے، اور رنج اوٹھاتا ہے اوس کے مقابلے میں "راحت از رنج" وہ حالت ہے،

[1] زاد المسافرین ص۲۳۵، ۲۳۶، [2] ر ص۲۳۶، [3] ر ص۲۴۱،

کہ جب انسان اس سے اپنے طبیعی حال کی طرف عود کرتا ہے، تو اپنے اصلی حال پر آجاتا ہے، چنانچہ جب وہ تندرستی کے بعد بیمار ہوتا ہے، تو تکلیف اوٹھاتا ہے اور جب پھر تندرست ہوجاتا ہے، تو اپنے پچھلے حال کی طرف عود کرتا ہے، اور اس سے اوس کو نہ لذت حاصل ہوتی ہے، نہ رنج، رازی کی غلطی یہ ہے کہ اُس نے طبیعی حال کی طرف عود کرنے کو لذت کہا، دراصل یہ حالت نہ لذت کی ہوتی ہے، نہ رنج کی، دوسرے الفاظ میں لذت ایک ایجابی حالت ہے، اور راحت از رنج رہیں، رازی اسی نکتہ تک نہ پہنچ سکا۔[۱]

اس کائنات میں طبائع کو "ہدایت الٰہی" حاصل ہے، جس کی مدد سے وہ اپنے مصالح کی نگہداشت کرتے ہیں، اور جو بھی اپنے مصالح کی نگہداشت کرتا ہے، اس کو لذت حاصل ہوتی ہے، اسی ہدایت الٰہی کی وجہ سے یہ اپنے آپ کو فساد، فنا اور رنج سے محفوظ رکھتے ہیں، یہ طبائع کیلئے بمنزلہ روح کے ہے کہ ان میں قوت حس نہیں ہوتی، اب تمام نفوس اپنے اپنے شرف کے مطابق اس ہدایت الٰہی سے متمتع ہوتے ہیں، چنانچہ نفس ناطقہ بمقابلہ نفس حیوانی اور نفس حیوانی بمقابلہ نفس نباتی اس سے زیادہ مستفید ہوتا ہے، بہرحال موجودات میں سے کوئی بھی ایسا نہیں، جو ہدایت الٰہی سے بہرہ ور نہ ہو، کیونکہ ان کے لئے بقا ہے، اور بقائے موجودات "ہدایت الٰہی" سے ہوتی ہے، اب لذت کی کیفیت اور کمیت اسی ہدایت الٰہی سے استفادہ پر موقوف ہوتی ہے، چنانچہ نباتات کیلئے غذا حاصل کرنے، اپنی طرح کے بچے پیدا کرنے اور نسل بڑھانے وغیرہ میں لذت ہے، لیکن حیوان میں چونکہ روح حسی ہوتی ہے، لہذا اوس کی لذت نباتات کی لذت سے بیشتر ہوتی ہے، اس میں نباتات کی لذات کے علاوہ حسّی لذتیں بھی ہوتی ہیں، اسی طرح نفس ناطقہ کی لذتیں نفس حیوانی کی لذتوں سے بھی زیادہ ہوتی ہیں، چنانچہ اوس کی لذتیں حسّی بھی ہوتی ہیں، اور عقلی بھی، بلکہ یہاں تک کہا جاسکتا ہے، کہ تمام حسّی لذتیں صرف انسان ہی کو حاصل ہوتی ہیں، صرف انہی لذتوں پر غور کرو، جو ایک قوت ذائقہ ہی سے حاصل ہوتی ہیں، اس قوت سے جو لذتیں حیوانات کو حاصل ہوتی ہیں، وہ ان کے پاسنگ بھی نہیں ہوتیں۔[۲]

[۱] زاد المسافرین ص ۲۲۴، [۲] ص ۵۳، ۲۴۵، ۲۴۴

انسان کی لذتوں کا اندازہ اسی سے کرو کہ وہ اپنی ہر حس سے اس قدر لذتیں حاصل کرتا ہے کہ حیوانات بے حس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آتیں، پھر قیمتی جواہر، املاک فاخرہ، ریاست فرمانروائی وغیرہ سے جو لذت حاصل ہوتی ہے، وہ ان حسی لذتوں کے علاوہ ہے، ان سب پر مستزاد علمی لذات ہیں، کہ جن کو وہ اپنے قوا میں سے شریف ترین قوت سے حاصل کرتا ہے، اور یہ لذات حسی لذات کے مقابلے میں شریف تر، بیشتر، بلکہ بے نہایت ہوتی ہیں، وجہ اسکی یہ ہے کہ انسان کا نفس ان لذتوں کو اپنی ذاتی قوت سے حاصل کرتا ہے، اور اسمیں بھی شبہ نہیں کہ نفس جو جوہر بسیط ہے، بے نہایت ہے، جب کوئی چیز بے نہایت ہوتی ہے، تو اس کی قوت ذاتی بھی بے نہایت ہوا کرتی ہے، پھر نفس انسانی کی علم پذیری ایک ذاتی صفت ہے، لہذا جو علم کہ وہ حاصل کرتا ہے، اس سے وہ لذت پاتا ہے، پھر اس علم کی بدولت وہ اور برتر علم تک پہنچتا ہے، لہذا اس کی لذت بھی بیشتر ہوجاتی ہے، وقس علی ہذا یہ بالکل ناممکن ہے، کہ نفس انسانی ایسا ہوجائے کہ علم کو قبول نہ کرسکے، اس تمام گفتگو سے معلوم ہوتا ہے، کہ انسان کی لذات حسّی بے شمار ہیں، اور یہ کہ یہ لذات اس وجہ سے پیدا نہیں ہوتیں، کہ وہ اپنی طبیعت سے باہر ہوجانے کے بعد اپنی طبیعت کی طرف عود کرتا ہے اس کے علاوہ لذت علمی بھی اس کی بے نہایت ہوتی ہے، اور ہر علم میں نفس انسانی اپنے طبیعی حال سے باہر ہوجاتا ہے، اور اس سے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے، لہذا اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، کہ رازی کا نظریہ غلط ہے، واقعہ یہ ہے کہ طبائع بے حس کی لذت "ہدایت الٰہی" سے اون حرکتوں کے ذریعہ اپنی صورتوں کی نگہداشت کا نتیجہ ہوتی ہے، جو ان کے لئے بمنزلہ ارواح ہیں، مختصر یہ کہ حیوانات کی لذتیں نباتات کی لذتوں سے زیادہ ہیں، اور انسان کی حیوانات کی لذتوں سے زیادہ، یعنی نفوس کی لذتیں ان کے مراتب کے مطابق ہوتی ہیں،[۱] اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک نفس انسانی جس قدر زیادہ علم سیکھتا جاتا ہے، اسی قدر دور وہ ان لذات سے ہوتا جاتا ہے، جو اس میں اور بہائم میں مشترک ہیں۔[۲]

———•———

[۱] زاد المسافرین ص ۲۴۹، ۲۵، ۵۲، ص ۲۹۶، ص ۲۹۸

تلخیص و تبصرہ

چینی اسلامی لٹریچر

مشہور اسلامی رسالہ مسلم ورلڈ (اکتوبر ۱۹۳۳ء) مین ایک مضمون عنوان بالا سے شائع ہوا ہے، جس مین مقالہ نگار نے چینی اسلامی لٹریچر کے تین دور پیش کئے ہین، اور آخر مین اس خیال کا اظہار کیا ہو کہ اگر چین کے مسلمانون کو ملکی ترقی کا ساتھ دینا، اور اُس سے فائدہ اوٹھانا ہی، تو اونھین اپنے قدیم نظامِ تعلیم اور اسلامی معتقدات کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیے، اور تعلیم جدید کی روشنی مین اپنے لئے ایک مفید راہِ عمل اختیار کرنی چاہیے، ہم اس مفید مشورہ کو شکریہ کے ساتھ نظرانداز کرکے نفس مضمون کا خلاصہ ذیل مین درج کرتے ہین:-

چین کا آخری عظیم الشان شاہی خاندان منچو خاندان تھا اور اس کا پہلا جلیل القدر شہنشاہ کانگ ہسی (Kang Hsi) تھا، وہ ایک عالی دماغ مدبر ہونے کے علاوہ علم و فضل کا بھی بہت بڑا مربی تھا، اوس نے چین کے تمام وسیع لٹریچر کی ایک باقاعدہ فہرست مرتب کرائی اور لٹریچر کی ہر صنف کے نمونے خواہ وہ کسی زبان کے ہون، شاہی کتبخانہ مین جمع کرائے لیکن اس ذخیرہ کے متعلق آج بہت کم معلومات حاصل ہین، بہرحال جہانتک چینی اسلامی لٹریچر کا تعلق ہو کانگ ہسی کا عہدِ حکومت اس لٹریچر کی نشاۃ ثانیہ کا دور کہا جاسکتا ہے، اس دور کے مسلمان مصنفین مین سب سے ممتاز شخصیت لیو چیائے کی ہے،

۱- اسلامی نشاۃ ثانیہ اور لیو چیائے لین،

کانگ ہسی سے قبل جو کتابین جمع کی گئین ان مین عربی اور فارسی کی بھی بعض تصنیفات تھین، اور اون مین سے

چند تصنیفات کا ترجمہ بھی اوس عہد مین چینی زبان مین ہو گیا تھا، حال کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہی کہ چینی اسلامی لٹریچر کی سب سے قدیم کتاب جس کی تاریخِ تصنیف کی تعیین کی جاسکتی ہے، توضیح مذہب حق ہے، اوس کے مصنف کا نام وانگ تائے یو ہے، یہ کتاب پانچ جلدون مین ہے، اور غالبًا عہدِ منچو سے قبل کی لکھی ہوئی ہے، کیونکہ موجودہ نسخہ سے معلوم ہوتا ہو کہ اس کا پہلا دیباچہ ۱۶۴۲ء مین لکھا گیا تھا یعنی کانگ ہسی کی تخت نشینی سے تقریبًا بیس سال قبل اس کتاب مین بھی جیسا کہ چین کے قدیم اسلامی لٹریچر کی اکثر کتابون مین پایا جاتا ہے مسلمانون کے ساتھ مذہبی رواداری برتنے کا شاہی فرمان درج ہو، وانگ تائے یو کی تصنیف کی اشاعت کے تقریبًا ۳۵ سال بعد ایک قدیم تر کتاب کا ترجمہ شائع ہوا، جو ایران یا عرب کے خاندان یوان (YUAN) کے عہد مین لائی گئی تھی، اس کتاب کا نام حق کی طرف رجعت کرنے سے متعلق اہم باتین ہے،

اسی طرح ایک مختصر کتاب مسلمانون کی پہلی آمد کے نام سے ہے جسکی تاریخِ تصنیف متعین نہین لیکن اسکے ایک دیباچہ پر ۱۶۶۲ء درج ہے، جو کانگ ہسی کے عہدِ حکومت کا پہلا سال ہے، اس اہم کتاب مین چین مین مسلمانون کی پہلی آمد کے بابت نظریۂ رویا کی اشاعت کی گئی ہے، اور اس کے مطالعہ سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ چین مین اسلام کا داخلہ شہنشاہ تائے سنگ کی درخواست پر ہوا تھا، لیکن اس کتاب مین تاریخ کے حساب غلط ہین اور روایات متداولہ کے ثبوت کیلئے کافی نہین، تاہم اوسکی قدامت مین کوئی شبہہ نہین ہے،

مسلمانون کی پہلی آمد کے چند ہی سال بعد قبلہ نمائے اسلام کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی جس کا مصنف صوبہ یونن (Yunnan) کا ایک مسلمان ماون پنگ (Ma wenping) نامی تھا، اس کتاب کا چنگتو (Chengtu) اڈیشن ۱۸۶۵ء مین دس جلدون مین شائع ہوا، جو (۵۰۰) صفحات سے زائد ضخامت کا تھا، اوس کے علاوہ چھوٹے اڈیشن بھی نکلے، جنمین سے ایک خلاصہ قبلہ نما کے عنوان سے چار جلدون مین شائع ہوا، اس کتاب سے ابتدائی منچو عہد کے مسلمانون کے حالات پر روشنی پڑتی ہی، جو اپنی تعداد اور اہمیت کے لحاظ سے جنوبی مغربی صوبہ مین نمایان تھے، اس دور کا سب سے بڑا مصنف

یوچیائے لئین تھا،

یوچیائے لئین جس کو لیوچیہ (Liu Chih) بھی کہتے ہین خاندان منچو کے ابتدائی عہد مین شہر نانکنگ مین پیدا ہوا، اوس نے اپنی تمام عمر علم و فضل کی تحصیل مین صرف کردی، اوس نے ایک ایسا علمی معیار قائم کر دیا، کہ اوس کے بعد تمام چینی اسلامی فضلا نے اوسی کا تتبع کیا اوس کی ابتدائی کتابون مین ایک بہت مشہور کتاب فلسفہ اسلامی ہے، فلسفہ اسلام پر یہ ایک ایسی مختصر مگر جامع تصنیف ہے، کہ بعد کے مصنفین مین سے اکثرون نے اوسی سے مواد حاصل کیا ہے، فلسفہ اسلامی کے پہلے دیباچہ مین کانگ ہسی کے عہد حکومت کا تیرھوان سال ۱۷۰۴ء درج ہے، اس کتاب مین جغرافیہ اور اوس زمانہ کی تاریخ عالم سے متعلق نوین صدی عیسوی کی بہت سی شکلین اور نقشے بنے ہوئے ہین، اس کتاب کے بعد لیوچیائے لئین نے اس کا ایک خلاصہ اسلامی قوانین و رسوم کے اہم منتخبات" کے عنوان سے شائع کیا، جس کا دیباچہ ۱۷۱۰ء کا لکھا ہوا ہے، اس مین اسلامی عقائد اور رسوم سے متعلق مختلف مابعد الطبیعیاتی اور علمی مباحث ہین، یون تو لیوچیائے لئین نے بہت سی کتابین لکھین، لیکن اوس کی سب سے زیادہ عظیم الشان تصنیف سیرۃ النبی ہے، اس کتاب کی تاریخ تصنیف کے متعلق مختلف رائین قائم کیگئی ہین، لیکن عموماً اس کا سال تصنیف ۱۷۲۱ء اور ۱۷۲۴ء کے درمیان خیال کیا جاتا ہے، اور کثرت رائے یہ ہے کہ اس کا پہلا اڈیشن ۱۷۷۹ء مین شائع ہوا، لیوچیائے لئین سے قبل چین مین جو اسلامی لٹریچر موجود تھا، اوسے خالص علمی نہین کہہ سکتے تھے، اور نہ وہ زیادہ ضخیم تھا، اوس کا بیشتر حصہ قدیم تصانیف کے ترجمہ اور مواد نثر پر مشتمل تھا، اور اس مین قرآن پاک اور تفسیر پر خاص طور سے زور دیا جاتا تھا، لیوچیائے لئین کے وقت تک چینی نژاد مسلمانون مین تبحر علمی مفقود تھا،

لیوچیائے لئین کے بعد چین کے اسلامی کلچر کی دوسری تحریک شروع ہوئی، اور اس دوسرے دور کو دفاع اسلامی اور مافوچو کا دور کہتے ہین،

۲- دفاع اسلامی اور مافوچو کا دور،

۱۷۶۰ء کے قریب شہنشاہ چئین لنگ (Chien Lung) نے ترکستان کو سلطنت چین مین شامل کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وسط ایشیا اور چین کے تمدن (کلچر) مین باہمی مبادلہ ہونے لگا، اور جس طرح نشاۃ ثانیہ کا دور کانگ ہسی کے عہد سے شروع ہوا تھا، اوسی طرح دفاع اسلامی کے دور کی ابتداء چئین لنگ کی فتح ترکستان سے ہوئی، یہ دور مافوچو (Ma Fu chu) کے زمانہ مین اپنے شباب پر پہنچ گیا، مافوچو انیسوین صدی کے ابتدائی دور کا مشہور فاضل اور مدافع اسلام (APOLOGIST) تھا، اس وقت مغربی چین مین چینیون اور عیسائیون کی طرف سے اسلام پر سخت حملے ہو رہے تھے، مافوچو اوس جماعت کا سردار تھا، جو ان حملون کا جواب دے رہی تھی، مافوچو کو چینی اور عربی زبان کی قدیم تصانیف پر کامل عبور حاصل تھا، اوس نے پہلے اپنے بعض پیشروون کی کتابون پر نظر ثانی شروع کی، اور اس سلسلہ مین سب سے پہلے مافوچو کی تصنیف کو لیا، پھر عربی بہار و خزان کی سرگذشت پر نظر ثانی کی، حقیقت یہ ہے کہ دور جدید کے اکثر چینی اسلامی مصنفین تمامتر مافوچو ہی پر اعتماد کرتے ہین،

مافوچو نے اسلام کی مدافعت مین جو کچھ لکھا، اوس کی ابتداء اون تخیلات پر نقد و تبصرے کی جو اوس زمانہ مین ذات باری تعالیٰ کی نسبت قائم کئے جاتے تھے، اپنی کتاب "آسمان کی توضیح بلیغ" مین اوس نے اوس تعلق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، جو کنفیوسیس کے لفظ آسمان اور اسلامی لفظ اللہ کے درمیان ہے،

۱۸۴۲ء مین مافوچو نے اپنا روزنامچہ شائع کیا جو اوس نے ایک طویل سفر حج مین لکھا تھا، اس مین وہ روزانہ کے واقعات، منزلون کے فاصلے اور اون اشخاص کے حالات بیان کرتا ہے، جو اوسے سفر مین ملے تھے، یہ روزنامچہ پہلے عربی مین لکھا گیا تھا، بعد مین مافوچو کے ایک شاگرد اور مداح ماآن لی (MAAN LI) نے اوس کا ترجمہ چینی زبان مین کیا، مافوچو نے چین مین اسلام کی ترقی سے متعلق ایک فارسی کتاب کو دوبارہ اڈٹ کیا اور لوگون کی اخلاقی اصلاح کیلئے ایک کتاب بیداری عالم لکھی، اُس کو شاعری سے بھی ذوق تھا، اور وہ کنفیوسیس کے دیوان کے مثل اپنی غزلون کا بھی ایک مجموعہ مرتب کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ اس کام کو ختم نہ کر سکا

اور [illegible]ء میں صرف ایک دیباچہ لکھکر رہ گیا، بعد کو اوس کے شاگرد اور ادبی جانشین ماآن لی نے وہ مجموعہ تیار کیا، جو دیوان اسلامی کے نام سے مشہور ہے، ماآن لی نے مافوچو کی دو اور کتابوں چھپی نکلی، اور توضیح رسوم قواعد کا ترجمہ بھی کیا، اوس نے عربی فن شاعری پر خود بھی ایک کتاب لکھی جس کا نام اسلوب شعر عرب ہے، ماآن لی کے بعد چینی اسلامی لٹریچر کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے،

۲- تحریک جدید اور پانگ اسکول،

انیسوین صدی کے نصف آخر مین چین کے مسلمان زیادہ تر اپنے حقوق ملی کے اصول کیلئے جد و جہد کرتے رہے، اور اس زمانہ مین بہت کم اعلیٰ لٹریچر پیدا کر سکے، قیام جمہوریہ کے ساتھ ہی مغربی خیالات کا ایک طوفان ملک مین داخل ہو گیا اور ان جدید خیالات مین آرٹ، سائنس اور لٹریچر کے ساتھ حیات دنیوی اور مذہب کے متعلق بھی ایسے خیالات اور نظریات سامنے آئے جن سے ملک اوس وقت ناآشنا تھا، پانگ (Peking) کے نوجوان مسلمانون کی ایک جماعت جس نے قیام جمہوریہ مین نہایت سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا تھا، اوس وسیع تحریک مین شریک ہو گئی، جس کا مقصد چین مین جدید تہذیب و تمدن کو رواج دینا تھا، اور اس مقصد کیلئے سب سے پہلے اونھون نے زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے جدید نظام تعلیم کو مفید بنانا چاہا، چنانچہ اس جدید تر اختراع کا ایک بڑا حصہ نظام تعلیم کے سپرد کیا گیا، اور دوسرا بڑا حصہ پبلک پریس نے اپنے ہاتھون مین لیا، اور اخبارات و رسائل کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی، پانگ کے جدید اسکول کا نصف سے زائد لٹریچر اون چھوٹی چھوٹی کتابون پر مشتمل تھا جو پروپگنڈا کیلئے لکھی جاتی تھین اور جنمین سے کوئی بھی بیس پچیس صفحات سے زیادہ کی نہ تھی، پانگ کے مکتبۂ اسلامیہ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے، اور ایک کثیر تعداد مین اسلام پر چھوٹی چھوٹی کتابین شائع کی ہین، ان مین اکثر قدیم تصانیف کا خلاصہ ہین، جو عام فہم زبان مین مختصر کر دی گئی ہین، چین کے مسلمانون نے متعدد ہفتہ وار اور ماہوار رسالے نکالے، لیکن ان مین سے کوئی استقلال اور کامیابی کے ساتھ جاری نہ رہ سکا جس کی ایک وجہ غالباً مالی دقت ہے،

چین کے جدید نظام تعلیم کا اثر وہان کے تمام لٹریچر پر پڑا ہے جسمین اسلامی لٹریچر بھی شامل ہے، اور اس نظام نے وہان کے اسلامی کلچر پر بھی بہت کچھ اثر ڈالا ہے، حکومت کی جانب سے جو نظام تعلیم قائم کیا گیا ہے اوس نے قدیم اسلامی مدارس کی بنیادین ہلا دی ہین، اور معدودے چند کے علاوہ جو مدرسے مسجدون مین قائم ہین اون کی حالت آج کل قابل اطمینان نہین ہے، اونھین مالی دقتون کا سامنا ہے، احادیث نبوی کی تعلیم انھی مدارس مین ہوتی ہے اور علوم قدیمہ پر خاص طور سے زور دیا جاتا ہے، پانگ کے جدید اسکول مین تعلیم کے مسئلہ مین بظاہر دو جماعتین قائم ہو گئی ہین، نوجوان طبقہ جدید نظام تعلیم کو رائج کرنا چاہتا ہے، اور علوم جدیدہ کی تحصیل پر زیادہ زور دیتا ہے، برخلاف اوس کے شیوخ (AHUNGS) کی جماعت جس کے اکثر افراد سمرقند و بخارا سے آئے ہین، اس جدید نظام کی مخالف ہے اور وہ علوم قدیمہ پر زیادہ زور دیتی ہے، اس مین شبہ نہین کہ چین مین مسلمانون کی انفرادیت اسی قدیم نظام تعلیم کی وجہ سے قائم ہے، جس پر یہ شیوخ زور دیتے ہین، لیکن اب ان کا اثر کم ہو رہا ہے،

چین مین تحریک جدید کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ قرآن اور متعلقات قرآن پر پھر زور دیا جا رہا ہے، اسکے ساتھ ہی عبادات کے ظاہری ارکان پر بھی اصرار کیا جاتا ہے، چنانچہ نماز اور دوسری عبادتون کے ارکان کی اہمیت سے متعلق مسلسل چھوٹی چھوٹی کتابین شائع ہوتی رہتی ہین،

اسلامی کلچر نے چینی زبان پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے، اور تمام چین اور خصوصاً وسط ایشیا مین روزمرہ کے استعمال کے آسان اسلامی الفاظ مثلاً اللہ، مسجد، امام، اور قرآن، غیر مسلم چینیون مین بھی رائج ہین، پانگ اسکول نے مسلمان لڑکون اور لڑکیون کی تعلیم کیلئے طریقۂ نظم اختیار کیا ہے یعنی نظمون کے ذریعہ سے وہ بچون کو اسلامی تاریخ وغیرہ کی تعلیم دیتے ہین تاکہ بچے اسے آسانی کے ساتھ ذہن نشین کر سکین، اس قسم کی متعدد نظمین چھپکر شائع ہو گئی ہین، حال مین چینی مسلمانون نے سوال و جواب کے ذریعہ سے بھی تعلیم دینے کا طریقہ اختیار کیا ہے، چھوٹی چھوٹی کتابون مین دین کے بنیادی عقائد اور اہم باتین سوال و جواب کے طریقہ پر تصریح کے ساتھ بیان کر دی گئی ہین،

(باقی)

طوفانون کے اسباب اور موسم کے تغیرات

ہم ہوا کے ایک سمندر کی تہ مین رہتے ہین جو کم سے کم سو میل بلکہ شاید تین سو میل گہرا ہے، یہ ہوا مختلف گیسون سے مرکب ہے، نیچے کی سطحون مین بہت زیادہ ثقیل اور اوپر کے حصّون مین ہلکی اور لطیف ہے، اسمین دھوان، گرد و غبار اور رطوبت ملحق رہتی ہے، موسم کے متعلق پیشین گوئی کرنے والون کا خیال ہے، کہ کرۂ ہوائی مین تین طبق ہین، درمیانی طبق جسے ٹروپوپاز (Tropopause) کہتے ہین، طوفانی حصّہ کو جس کا نام ٹروپواسفیر (Troposphere) ہے، اسٹراٹواسفیر (Stratosphere) سے علحدہ کرتا ہے، جو سب سے بالائی طبق ہے، کرۂ ہوائی اوپر کی طرف سے آفتاب کی گرمی سے اور نیچے کی طرف سے سمندرون اور خشکی کے گرم حصّون کی گرمی سے گرم ہو جاتا ہے، البتہ مختلف مقامات کی بلندی ارض البلد موسم اور سطح زمین کی ساخت کے اختلاف کی وجہ سے ان مقامات کی حرارت مین اختلاف ہوتا ہے، ٹروپواسفیر سے گذر کر اوپر جانے مین حرارت بتدریج کم ہوتی معلوم ہوتی ہے، اور سب سے اوپر کے طبق مین یہ تخفیف موقوف ہو جاتی ہے، ان تغیرات سے بہت سی ہوائی موجین (CURENTS) پیدا ہوتی ہین، ان مین سے بعض مستقل اور اکثر مقامی اور غیر مستقل ہوتی ہین، انھی مین قطبین کی موجین بھی ہین، شمال کے برف پوش حصّون سے غیر متعین وقفون کے بعد ثقیل اور سرد ہوا کی موجین چلتی ہین، یہ اون گرم اور مرطوب ہواون سے ملتی ہین، جو منطقۂ حارہ سے بہتی ہوئی آتی ہین، سرد موجین گرم موجون کے نیچے سے بہتی ہین، اور اون کو اوٹھا کر بلند تر حصّہ مین پہنچا دیتی ہین، جہان یہ گرم موجین بہت جلد سرد ہو جاتی ہین، رطوبت منجمد ہو کر بادلون کی شکل اختیار کر لیتی ہے، مخالف موجون مین گردش ہونے لگتی ہے، اور وہین بڑے بڑے بگولے پیدا ہو جاتے ہین،

یہ موسم کے حقیقی اسباب اون قوتون مین تلاش کرنے چاہئین، جو سرد اور گرم ہواون کی ان

زبردست موجون کو تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ان کے اصلی مقامات سے حرکت مین لاتی رہتی ہین، ایک نظریہ جواب سے پہلے تسلیم کیا جاتا تھا، یہ ہے کہ آفتاب سے جو تمازت پہنچتی ہے اوسی کے تغیرات سے موسم مین تبدیلی واقع ہوتی ہے، اور خود یہ تغیرات آفتاب کے دھبون سے پیدا ہوتے ہین،

اول اول جب تمازتِ آفتاب کا اندازہ کرنے کیلئے آلات وضع کئے گئے، تو اہم تغیرات کا انکشاف ہوا، لیکن ان ابتدائی آلات سے بالکل صحیح نتائج معلوم نہین ہوتے تھے، بعد کے باریک تر آلات نے تمازت کے ان تغیرات کو بہت کم دکھایا ہے، اور اب بہت سے ماہرین فن کا خیال ہے کہ یہ تغیرات اس قدر خفیف ہوتے ہین کہ ان سے موسم مین تبدیلی پیدا نہین ہو سکتی،

یہ نظریہ بظاہر ناکام ہو چکا ہے، لیکن اس کے بجائے ابھی تک کوئی دوسرا نظریہ موسم کے اسباب کے متعلق قائم نہین ہو سکا ہے، اور تغیراتِ موسم کے حقیقی اسباب ہنوز پردۂ راز مین ہین اس سلسلہ مین یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ قطبین کے قریب کرۂ ہوائی کی کیا کیفیت رہتی ہے۔ دوسرا بین الاقوامی قطبی سال (POLARYEAR) جس مین پچیس ۲۵ سے زائد قومون نے شریک ہو کر ایک سال کیلئے ایسے اسٹیشن قائم کئے تھے، جہان سے قطبین کے کرۂ ہوائی کی کیفیت معلوم کی جا سکے، ابھی حال مین ختم ہوا ہے، اور اس ایک سال کی کاروائی سے جو نتائج حاصل ہوئے ہین، اون سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی اور جنوبی دائرون (Arctic and antarctic Circles) مین کم از کم بیس مستقل اسٹیشنون کی ضرورت ہے، چنانچہ اب ایسے چند مستقل اسٹیشن قائم کئے جا رہے ہین اور ضروری سرمایہ کی فراہمی کے بعد کافی تعداد مین قائم کر دئے جائین گے، اوس وقت امید ہے کہ موسم کی تبدیلیون کا راز ایک بڑی حد تک کھل جائے گا،

(لٹریری ڈائجسٹ)

"ع ز"

اخبار علمیہ

امریکہ میں اسلامی آرٹ کی نمائش

میٹروپولیٹن میوزیم (Metropolitan Museum) نیویارک (امریکہ) میں آجکل اسلامی آرٹ کی نمائش ہورہی ہے، یعنی آرٹ کے ان مختلف اصناف کی جو اسلامی ممالک سے تعلق رکھتے ہیں، اور جنمیں مصوری، نقاشی، کوزہ گری، جلد سازی، اور خوشنویسی شامل ہیں، اس نمائش میں جو مخطوطات پیش کئے گئے ہیں، ان کا بیشتر حصہ غیر مذہبی کتابوں پر مشتمل ہے، اور ان میں بھی زیادہ تر کتابیں ایران سے متعلق ہیں، ان کتابوں اور تصویروں سے بارہویں صدی سے لیکر پندرہویں صدی عیسوی تک کے ایرانی طرز معاشرت کے بعض دلچسپ حالات معلوم ہوتے ہیں، ایرانی تصویروں اور کتابوں کے نقش ونگار میں اکثر نیلا اور سنہرا رنگ پایا جاتا ہے، اگرچہ کہیں کہیں سرخ، بادامی، اور سبز رنگ بھی نظر آجاتا ہے، اس میں شاہنامہ کی مختلف دلچسپ تصویریں ہیں، ان میں سے ایک تصویر زال کی ہے، جب وہ اپنی معشوقہ رودابہ کے بالاخانہ پر چڑھ رہا تھا، دوسری بہرام گور کی جو ایک اژدہے کو قتل کررہا ہے، دو تصویریں قدیم تاریخ سے متعلق بھی ہیں، ایک میں دکھایا گیا ہے کہ فرامرز ایرانی فوج کو کابل پر چڑھائی کے لیے جارہا ہے، دوسری میں سکندر آتش بار آلات سے ہندوستان میں جنگ کررہا ہے، ایک تصویر اور ہے جس میں سکندر کی موت دکھائی گئی ہے، اس نمائش کی اکثر تصویریں مختلف افراد کی ملک ہیں، لیکن خود میوزیم کی انعامی تصویروں میں ایک نایاب تصویر یونس وماہی کی ہے جو حال میں حاصل کی گئی ہے، اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ یہ رشید الدین کی جامع التواریخ سے نکالی گئی ہے، جس کا نسخہ پہلے سلاطین عثمانیہ کے کتب خانہ میں تھا، تصویروں کا ایک اور نایاب مجموعہ کتبخانہ مارگن سے لایا گیا ہے، اس میں تیرہویں صدی عیسوی کے ایک قلمی

نسخہ کی جو عہد منگول کا قدیم ترین علوم ایرانی مخطوطہ خیال کیا جاتا ہے، متعدد تصویریں ہیں جنمیں رنگ برنگ کے جانوروں کی شکلیں بنی ہوئی ہیں، ان تصویروں کے علاوہ ایک تصویر حضرت عیسیٰؑ کی جو ایک زاہد اور ایک گناہگار سے باتیں کررہے ہیں، ایک بڑی تعداد اُن تصویروں کی ہے جنمیں شکار، گوے چوگان، باغ، دربار شاہی اور معاشقہ کے مناظر دکھائے گئے ہیں، جانوروں میں کتا، اونٹ، ہاتھی، ہرن، اور گینڈے کی تصویریں ہیں، بعض تصویروں میں دکھایا گیا ہے کہ جراح نشتر لگارہا ہے اور بعض میں طبیب جادوگروں کا علاج کررہا ہے، جس میں نوجوانوں اور بادشاہوں کی تصویریں بھی ہیں، اس نمائش میں یورپ کے مختلف ممالک نے اپنے نوادر بھیجے ہیں، فرانس کے قومی کتبخانہ (Bibliotheque Nationale) نے بھی جس نے اس سے قبل کوئی چیز فرانس سے باہر نہیں بھیجی تھی، سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی کی ایرانی اور ترکی تصویروں کے دو مجموعے پیش کئے ہیں، نمائش کا غالب حصہ ایرانی آرٹ کے نمونوں پر مشتمل ہے، لیکن چونکہ بعض نمونے ترکی اور ہندوستانی آرٹ کے بھی رکھے گئے ہیں اس لیے اس کا نام "اسلامی آرٹ" کی نمائش رکھا گیا ہے،

گرم چشموں اور آتشفشاں پہاڑوں کا استعمال

اٹلی کے بعض انجنیروں نے حال میں ایک جدید گرم چشمے کو قابو میں کیا ہے جس کے تیز اور ابلتے ہوئے پانی سے وہ مشینوں کے لیے برقی طاقت حاصل کریں گے، ان کے پیش نظر وہاں کے آتش فشاں پہاڑوں سے متعلق بھی اہم تجاویز ہیں اور وہ ان پہاڑوں سے جنھوں نے ابتک اپنی ہلاکت پاشیوں سے اٹلی کو شدید نقصانات پہنچائے ہیں، اسی قسم کی طاقت حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ اگر وہ اپنی تجاویز میں کامیاب ہوئے تو ایک غیر محدود طاقت کا خزانہ ہاتھ آجائے گا، چنانچہ ان میں سے بعض تجاویز پر ایک حد تک عمل بھی شروع کردیا گیا ہے، پروفیسر پونتے (Ponte) کا رصدخانہ سسلی کے مشہور کوہ آتشفشاں اٹنا پر واقع ہے، صرف پانچ سال ہوئے اس زبردست پہاڑ کے پھٹنے سے ۲۰ لاکھ پونڈ کی مالیت کا نقصان ہوچکا ہے، جو بھاپ اس پہاڑ سے

نکلتی ہے، پروفیسر موصوف اس سے موسم سرما میں اپنے صدر خانہ کو گرم کرنے کا کام لیتے ہیں، اٹنا کے دہانہ کے قریب جو شگاف ہیں جنسے بھاپ نکلتی رہتی ہے، ان کے اندر دور تک نلکیاں لگا دی گئی ہیں، اور ان نلکیوں کا دوسرا سرا صدر خانہ کی عمارت میں داخل کر دیا گیا ہے، وہاں ان سے کھلمندن (Value) اور روک گھڑی (Stop cocks) کے ذریعہ سے حسب ضرورت حرارت لیجاتی ہے، اس سلسلہ میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس ملک نے کرۂ زمین کی اندرونی حرارت کو سب سے زیادہ قابو میں کیا ہے، وہ آئس لینڈ ہے، وجہ یہ ہے کہ باوجود ایک برفستانی ملک ہونے کے وہاں گرم پانی کے چشمے اور آتش فشاں پہاڑ دنیا کے ہر ملک سے زیادہ ہیں، اور اگرچہ اس جزیرہ میں ایک سو سے زیادہ ایسے چشمے موجود ہیں جنہیں برف کے بڑے بڑے ٹکڑے بہتے رہتے ہیں، تاہم تقریباً ایک سو بیس کوہ آتشفشاں اور سات سو گرم چشمے بھی ہیں، اندازہ یہ ہے کہ یہ چشمے سال میں دو ارب گیلن گرم پانی باہر پھینکتے ہیں، اگر اس پانی سے برقی طاقت حاصل کیجائے تو کوئلے اور لکڑی کی ایک کثیر مقدار بچ جائے گی اور ترکاریوں کے پیدا کرنے کے لیے ہزاروں ایکڑ زمینیں جن پر شیشہ کی عمارتیں کھڑی ہیں گرم کیجا سکیں گی، چند سالوں سے اس کا تجربہ نہایت کامیابی کے ساتھ کیا جا رہا ہے، اور یہ حرارت مدرسوں، مکانوں اور پنیر و مکھن بنانے کی مشینوں کے گرم رکھنے میں استعمال کیجارہی ہے، اس کے علاوہ ہر قسم کی ترکاریاں مثلاً ٹوماٹو، کھیرا، ککڑی، کاہو، آلو وغیرہ اب آسانی سے پیدا کیجا سکتی ہیں، بعض گرم چشمے پھیپھڑے کے مریضوں کے لئے بھی صحت بخش ثابت ہوئے ہیں، اور ان میں سے ایک کے قریب ایک دار الصحت (SANATORIUM) قائم کر دیا گیا ہے،

دانت کی بیماریوں سے متعلق جدید معلومات

دانت کی بیماریوں سے متعلق ڈاکٹر بننگ (Bunting) میچیگن یونیورسٹی (امریکہ) نے رسالہ لٹریری ڈائجسٹ میں کچھ دلچسپ اور مفید معلومات شائع کئے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ گذشتہ دس سال کے

تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ غذا کو دانت کی بیماریوں سے بہت کچھ تعلق ہے، یہ تجربہ شروع میں جانوروں پر کیا گیا اور یہ دیکھا گیا کہ بعض قسم کی غذاؤں کے استعمال سے دانت خراب ہو جاتے ہیں اور دوسری قسم کی غذاؤں سے وہ خرابیاں پیدا نہیں ہوتیں، اس کے بعد بچوں پر تجربہ کیا گیا اور یتیم خانوں اور مختلف ملکی اداروں کے بچوں کو صحیح غذائیں دیکر معلوم کیا گیا کہ ان میں دانت کی بیماریاں کم ہو گئیں، اس کے متعلق متعدد نظریئے پیش کئے گئے ہیں، ایک خیال یہ ہے کہ دانت کی بیماریوں کا اصلی سبب کیلسیم (Calcium) یا فاسفورس (Phosphorus) کی کمی ہے، دوسرا خیال یہ ہے کہ ان بیماریوں کے پیدا کرنے میں بعض وٹامن (Vitamin) کو سب سے زیادہ دخل ہے، چنانچہ جانوروں اور بچوں کو مختلف غذائیں دیکر یہ کوشش کی گئی کہ محض ان غذاؤں کے استعمال سے دانت بیماریوں سے محفوظ رہیں، لیکن اب تک ایسی کوئی غذا معلوم نہیں کی جا سکی ہے جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے، میچیگن یونیورسٹی (امریکہ) کے محققین کی ایک جماعت چار سال سے اس مسئلہ کا مطالعہ کر رہی ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ دانت کی خرابیوں کا بہت بڑا سبب ایک خاص قسم کے جرمات (Bacteria) ہیں جو منھ کے اندر پائے جاتے ہیں اور جنکو باسیلس السیڈ وفلیس (Bacillus acidophilus) کہتے ہیں، بعض لوگ ان جرمات سے قدرۃً محفوظ رہتے ہیں، کیونکہ یہ ان کے منھ میں پیدا ہوتے ہی نہیں، ایسے لوگوں کے دانت خراب نہیں ہوتے، لیکن اکثر آدمیوں کے منھ میں یہ جرمات رہتے ہیں، اور اپنی کثرت و قلت کی مناسبت سے دانتوں کو خراب کرتے رہتے ہیں، محققین کی اسی جماعت نے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ اگر بچوں کی غذاؤں کی سختی کیساتھ نگرانی کیجائے اور انھیں میٹھی چیزیں کم دیجائیں تو یہ جرمات بہت کم ہو جاتے ہیں اور دانت کی بیماریاں بڑھنے نہیں پاتیں، برخلاف اس کے زیادہ شکر کے استعمال سے جرمات تیزی کیساتھ بڑھتے جاتے ہیں، اور اکثر صورتوں میں دانت جلد خراب ہو جاتے ہیں، دانتوں کو محفوظ رکھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ انھیں جہاں تک ممکن ہو ہر وقت صاف رکھا جائے اور ایسی غذا استعمال کیجائے جس کے اجزا متناسب ہوں اور جس میں شکر کم سے کم ہو،

ع ز

ادبیات

خطاب بہ ملتِ افغان

از

جناب محمد یحییٰ صاحب اعظم گڈھ

جو کچھ تو نے کیا اچھا کیا اے ملتِ افغاں! ترے اندازِ ذوقِ خنجر اندازی کے میں قرباں

خبر بھی ہے؟ کہ اس آغاز کا انجام کیا ہوگا تری اس سعیِ نامحمود کا اتمام کیا ہوگا

ہمیں رونا ہے اے بدبخت! اس غفلت پرستی کا بکھرنے کو ہے شیرازہ ترے اوراقِ ہستی کا

بساطِ دہر سے مٹ جائیگا نام و نشاں تیرا زمانہ صرف رہ جائیگا اک افسانہ خواں تیرا

یہ مانا تیغ کے جوہر ہیں پنہاں تیری فطرت میں یہ مانا جنگ کے شعلے ہیں مضمر تیری طینت میں

یہ مانا برقِ سوزاں ہے ودیعت تیری خلقت میں یہ مانا آتشِ پیکار ہے تیری جبلت میں

یہ مانا قتل و خونریزی ہے داخل تیری سیرت میں یہ مانا گرمیِ ہنگامہ ہے تیری طبیعت میں

یہ مانا آتشِ سیال ہے تیری رگ و پے میں یہ مانا ہے بلا کی شورش و مستی تری مے میں

یہ مانا تیغ کے سایہ میں تو نے پرورش پائی یہ مانا تو نے رعد و برق سے سوز و تپش پائی

یہ مانا سرخیِ خوں سے تری تاریخ رنگیں ہے یہ مانا تیری فطرت کا تقاضا رقصِ خونیں ہے

زبانوں پر ہے افسانہ ترے جوشِ شجاعت کا زمانہ معترف ہے تیری ترکانہ شہامت کا

جہاں ہے لرزہ براندام تیری عسکریت سے ہزبرانِ دلاور کانپتے ہیں تیری ہیبت سے

مسلّم ہے زمانہ میں ترا آئینِ جانبازی تجھے ہے جنگجو اقوام میں حاصل سرفرازی

مگر اے ملتِ خودکام! یہ کسکے مقابل میں مگر اے عبرتِ اقوام! یہ کسکے مقابل میں

یہ صہبائے کہن ہے آہ تیری سرخوشی کب تک؟ یہ فرطِ غیظ سے ظالم! تری محسن کشی کب تک؟

گرانی تھی جسے برقِ بلا اعدا کے خرمن پر وہ تیغِ خونفشاں چلتی ہے اب خود اپنی گردن پر

مٹایا تو نے ظالم! آہ اس غازی کی ہستی کو بلند آگر کیا جس نے لوائے حق پرستی کو

چھڑایا تجھکو اک پنجۂ سفاک سے جس نے بچایا تجھکو اک طوفانِ خون و خاک سے جس نے

وہ غازی، ڈوبتی کشتی کی جسنے ناخدائی کی صفِ باطل سے تنہا جسنے قوت آزمائی کی

بچالی دستِ غارتگر سے تیری آبرو جس نے خزاں دیدہ چمن کو دی بہارِ رنگ و بو جس نے

نکالا جسنے تجھکو پستیِ قعرِ مذلت سے نگاہیں آشنا کردیں فضائے اوج و رفعت سے

دبایا جس نے سیلابِ تفرنج کے تلاطم کو دماغوں سے مٹایا غیر کے ذہنی تحکم کو

محاسن ہی فقط حاصل کئے درسِ تمدن کے نہ الجھا خار سے دامن لئے پھول چُن چُن کے

اچھالا نام ملک و قوم کا اقوامِ عالم میں نئے سر سے کیا شانہ وطن کی زلفِ برہم میں

نشاطِ کامرانی ہر دلِ افسردہ کو بخشی بہارِ رنگ و بو پھر گلشنِ پژمردہ کو بخشی

ضیا اندوز تھا دروں سے تیرے مہرِ نورانی درخشاں کس قدر تھا تیرا دورِ نشاۃِ ثانی

دوبارہ اسکے دم سے قالبِ مردہ میں جان آئی زمانہ کو دکھایا اس نے اعجازِ مسیحائی

شریعت پر تھا مبنی اس کا آئینِ جہانبانی دلِ بیدار تھا لذت شناسِ ذوقِ ایمانی

شعارِ دیں پہ قائم اسکی تدبیرِ سیاست تھی صدائے حق کے آگے سر بسجدہ اسکی سطوت تھی

بظاہر گرچہ وہ اجلالِ شاہانہ کا حامل تھا حقیقت میں مگر روشن نفس درویشِ کامل تھا

زسرتا پا یقیں تھا، صاحب ایمانِ محکم تھا ۔۔۔ یقیناً عالم اسلام کا صند ید اعظم تھا

مدبر تھا، مفکر تھا، بہادر تھا، مجاہد تھا ۔۔۔ سرِ اورنگ قیصر تھا، سرِ سجادہ زاہد تھا

امیرِ کشورِ جاں تھا، جہانگیر و جہاںباں تھا ۔۔۔ بہارِ باغِ ایماں تھا، چراغِ بزمِ عرفاں تھا

معارف کا مبلغ، حکمت و دانش کا داعی تھا ۔۔۔ وقارِ ملک و ملت کے لیے گرم مساعی تھا

وطن کا مایۂ صد ناز فرزند گرامی تھا ۔۔۔ وہ زورِ بازوے اسلام تھا، ملت کا حامی تھا

بظاہر گو وہ کابل کے افق پر جلوہ آرا تھا ۔۔۔ مگر کل مطلعِ اسلام کا روشن ستارا تھا

نہ اٹھا دورِ آخر میں کوئی عالی ہمم ایسا ۔۔۔ ہوا اب تک نہ تجھ میں صاحبِ سیف و قلم ایسا

کیا حق مرتے دم تک حبِ قومی کا ادا اُس نے ۔۔۔ وطن کی راہ میں جانیں لڑادیں بارہا اُس نے

ہزاروں ہیں مظاہر اسکی شانِ خسروانی کے ۔۔۔ ہیں روشن کارنامے اسکی فتح و کامرانی کے

وطن کا گوشہ گوشہ شاہد اسکی ترکتازی کا ۔۔۔ فسانہ ذرہ ذرہ کی زباں پر دلنوازی کا

نہ دی کچھ داد تونے آہ اسکے سعی پیہم کی ۔۔۔ نہ جانی قدر تونے آہ اُس سالارِ اعظم کی

خود اپنے ہاتھ سے "وہ ہستی نادر" گنوائی ہے ۔۔۔ نظیر اس کی نہ پائیگی نہ اب تک تونے پائی ہے

یہ ممکن ہو بھلا دے تو مگر اسکی خدمت کو ۔۔۔ نہ رو دے حشر تک اے قوم تو اُس جانِ ملت کو

تڑپے گی صدیوں مع کابل اسکی فرقت میں ۔۔۔ وطن کی خاک لیگی اُسکو آغوشِ محبت میں

عقیدت سے جگہ آنکھوں میں دیگی ایسے جنرل کو
بھلائیگی بھلا تاریخ کیونکر "فاتح تھل" کو

کلیات شبلی (فارسی)

مولانا کے تمام فارسی قصائد، غزلیات، مثنویات، قطعات کا مجموعہ جو اب تک متفرق طور پر دیوان شبلی، دستۂ گل، بوئے گل، برگ گل کے ناموں سے چھپے تھے، اب سب یکجا کر دئے گئے ہیں، مع چند نوکے ولایتی کاغذ پر نہایت عمدہ چھپا ہو ضخامت ۱۰۴ صفحے، قیمت: ۱۲؍
"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

فلسفۂ نفس، مصنفہ جناب ضامن صاحب نقوی، ناشر ہندوستانی اکیڈمی یوپی، الٰہ آباد، حجم ۱۰۸ صفحے، لکھائی چھپائی ٹائپ میں، کاغذ دبیز، قیمت درج نہیں،

علم النفس، قدیم و جدید دونوں فلسفوں میں حکماء و فلاسفہ کا مستقل موضوع بحث و نظر رہا ہے، اور ان کے مختلف دوروں میں اس پر مختلف نقطۂ ہائے نظر کے ساتھ غور و فکر ہوتا رہا، یہانتک کہ دورِ حاضر میں تو اس نے ایسی شکل اختیار کرلی کہ یہ علم شاخ درشاخ ہوکر مختلف مستقل علوم میں تقسیم ہوگیا، اور یہ فروع اپنی اصل سے ایسی جداگانہ حیثیت میں آگئے کہ ان دونوں میں لاہوتی و ناسوتی، علوی و سفلی، روحانی و مادی کی متباین نسبتیں قائم ہوگئیں، مصنفِ "فلسفۂ نفس" نے اس تصنیف میں انھی ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑ کر اس تباین و تناقض کو دور کرنا چاہا ہے، اور قارئین کے خیالات کی مادی سے روحانی، سفلی سے علوی اور ناسوتی سے لاہوتی جانب رہنمائی کرنے کی کوشش کی ہے، یہ کتاب نہ علم النفس سے متعلق محض حکماے قدیم کے خیالات و افکار کی ترجمان ہے، اور نہ اس میں علم النفس کے متعلق فلاسفہ کے جدید خیالات و نظریات ہی تعیین کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں، بلکہ مصنف کے ذہن میں علم النفس کے قدیم و جدید دونوں قسم کے مباحث کے مطالعہ سے جو خیالات و نتائج مستحضر ہوئے، انھی کو ایسے ربط و تسلسل کے ساتھ قلمبند کیا ہے کہ کتاب کے نتیجہ بحث میں انسانیت کا شرف امتیاز محض حق و حقیقت کا ادراک قرار پاتا ہے اور پھر حیات و کائنات کا مقصدِ وحید محض حق شناسی نکلتا ہے، اور یہ حق شناسی خودشناسی پر منتج ہوتی ہے، اور پھر یہی خودشناسی، خداشناسی کے رتبۂ بلند کو حاصل کرتی ہے،

کتاب، مولٰنا عبد الماجد صاحب دریابادی، بی اے کے "تعارف" کے بعد ایک مقدمہ اور چار ابواب پر

مشتمل ہے، پہلے باب میں نفس اور اسکی ماہیت پر بحث ہے، دوسرا باب نفس کے افعال و قویٰ کے ذکر میں، تیسرے باب میں نفس کے متعلقات کا بیان آیا ہے، اور چوتھا باب "بعض معارف نفسیات" کے عنوان سے ہے، اور اسی میں تمام مباحث کا خلاصہ سمٹ کر آگیا ہے، کتاب کے مسائل قدیم بھی ہیں اور جدید بھی، لیکن اظہار مطالب کے لیے اسلوب بیان جدید ہی ہے، اور جناب مصنف کی یہی بڑی کامیابی ہے کہ وہ علم النفس کے متعلق مغرب کے جدید نظریوں اصطلاحوں اور تعبیروں کو اس طرح کھینچ کر مشرق کی سمت لائے ہیں کہ مغرب کے نظریوں اور اصطلاحوں کی روشنی میں مشرقی مسائل و عقاید کی بھی تعبیر ہو سکتی ہے، اگرچہ کتاب میں کہیں کہیں مباحث میں تشنگی باقی رہ گئی ہے، مثلاً جہاں مسئلہ وحدۃ الوجود سے گریز کے بعد مسئلہ توحید کا ذکر آیا ہے، لیکن بہرحال یہ امور لائق اعتنا نہیں، مناسب ہو اگر جناب مصنف اسی اسلوب میں اپنے دوسرے متخیلہ رسائل "حیات مابعد" کو بھی مرتب کر ڈالیں،

جامع اللغات و السنہ متعلقہ از جناب خواجہ عبدالمجید صاحب بی اے، ناشر جامع اللغات کمپنی لاہور،

حجم جلد اول ۵۰۴ صفحے، قیمت عـہ ؍ ہر حصہ ۱۰۰ صفحے قیمتی عہ ؍ تقطیع ۲۰×۲۶/۴، کاغذ عمدہ، سپید چکنا، لکھائی چھپائی اچھی،

"جامع اللغات" کا مفصل تذکرہ ان صفحات میں چند ماہ گذرے، آچکا ہے، کارکنان لغت نہایت مستعدی سے اس کے حصے حسب اعلان ۱۰۰، ۱۰۰ صفحوں میں نکال رہے ہیں، اب تک اس کے نو حصے ہمیں موصول ہو چکے ہیں، جنمیں جلد اول ۵۰۴ صفحوں پر تمام ہو کر جلد ثانی کے ۷۵ صفحے بھی آگئے ہیں، جلد اول حرف "ب" پر ختم ہوتی ہے، اور دوسری جلد کے ان ۷۵ صفحوں میں حرف "پ" کا آخری لفظ "پرائی" ہے، مؤلف نے انہی حصوں میں کتاب کا مقدمہ عنوان، اور سرورق بھی پیش کر دیا ہے،

مقدمہ ۸۸ صفحوں پر مشتمل ہے جس میں اجمال کے ساتھ اولاً "اردو کیونکر پیدا ہوئی" کو دکھایا گیا ہے، اسکے بعد اردو زبان کی تدریجی تاریخ بیان کی گئی ہے، اردو زبان کی پیدائش کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ کسی زمانہ میں صوبہ جد

سے مشرقی بہار تک کی زبان ایک ہی تھی، یہ کسی قدر محتاج تشریح اور باعث غلط فہمی ہے، مصنف نے اردو کی گذشتہ میں متداول نظریوں کو قبول کر لیا ہے، مثلاً "خالق باری" اردو کی پہلی منظوم تصنیف ہے، اردو کا سب سے پہلا بڑا صاحب دیوان شاعر، ولی دکھنی ہے، "فسانہ آزاد" سرشار کو اردو کا پہلا ناول سمجھنا چاہیے، اندر سبھا امانت اردو کا پہلا ناٹک ہے، ۱۸۳۶ء میں آغا محمد باقر نے پہلا اردو اخبار دہلی سے نکالا، اور اردو میں لغت کی سب سے پہلی کتاب "خالق باری" تصور کیجا سکتی ہے، آخر میں اردو کے متداول لغات کا تذکرہ اور ان میں موازنہ کیا گیا ہے اور سب سے آخر میں جامع اللغات کے خصوصیات اور رموز و اشارات ہیں، خدا مصنف کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے اردو کی ایک قابل قدر خدمت انجام دی، توقع ہے کہ یہ لغت اگر پورے طور پر پایۂ استناد حاصل نہ کر سکا، تو کم از کم اردو لغت سے متعلق موجودہ ضروریات کا پورا کرنے والا ضرور ثابت ہوگا،

مثنویات میر، مرتبہ جناب سید محمد صاحب ایم اے، ناشر مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن، تقطیع چھوٹی

۲۳۴ صفحے، قیمت مجلد عار

میر تقی میر کو تمام متاخرین شعراء نے اپنا "میر" تسلیم کیا ہے، دور حاضر کے ارباب ادب نے بھی ان کی قدر کی ان کی متعدد تصنیفات اب تک شائع ہو چکی ہیں، کلام کا انتخاب بھی ایک سے زیادہ نکل چکا ہے، اب مولوی سید محمد صاحب ایم اے، مؤلف "ارباب نثر اردو" نے "مثنویات میر" کے نام سے میر کی تمام مثنویوں اور مثنوی نما نظموں کو یکجا کر دیا ہے، ابتدا میں ایک مقدمہ لکھا ہے، جس میں میر کے مختصر حالات زندگی، اور ان سے ان کی مثنویوں پر روشنی ڈالی ہے، مثنویوں کی مجموعی تعداد ۳۳ ہے، جنمیں حسن و عشق کی داستانوں کی مثنویاں، ساقی نامے مدحیہ مثنوی، صید نامے، اور ہجویہ نظمیں سب شامل ہیں،

دیوان طباطبائی یعنی **صوت تغزل**

مجموعۂ کلام نواب حیدر یار جنگ مولانا علی حیدر طباطبائی نظم
حجم ۳۲۷، تقطیع چھوٹی، ناشر مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن
قیمت :- عار